جوڑے بنائے اس طرح وہ تمہیں پھیلاتا (تمہاری نسل چلاتا) ہے ایک
دوسری جگہ فرمایا:

ومن کل شیٔ خلقنا زوجین لعلکم تذکرون [1]

اور ہر چیز کے ہم نے جوڑے پیدا کیے تاکہ تم سمجھ سکو۔

ان آیات کریمہ نے صراحت کر دی کہ قانون زوجیت اپنی وسعت میں کائنات کی ہر شئے پر حاوی ہے اس سے نہ انسان مستثنیٰ ہے نہ دنیا کی کوئی دوسری چیز۔ اس چیز کو یوں بھی بیان کیا جا سکتا ہے کہ دنیا کی ہر شئے اپنے بعض ذاتی استعدادات اور نوعی خصوصیات اظہار کے لیے ایک میدان کی محتاج ہے اور صنف مقابل یہ میدان فراہم کرتی ہے۔ یہ ایک طرح کی نسبت ہے جو زوجین کے درمیان پائی جاتی ہے اور دونوں مساوی طور پر ایک دوسرے کے محتاج ہیں۔ اس میں کسی کی ذلت وحقارت اور عزت و سربلندی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا قرآن مجید میں ارشاد ہوا۔

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ [2]

وہ عورتیں تمہارے لیے لباس ہیں اور تم ان کے لیے لباس ہو۔

گویا اردو محاورہ کے مطابق دونوں میں لباس چولی دامن کا ساتھ ہے۔ وہ ان کے حق میں اوڑھنا بچھونا ہیں اور یہ ان کے حق میں۔ میاں بیوی میں وہی قرب واتصال اور وہی نسبت ہے جو لباس اور جسم میں ہوتی ہے۔ امام رازیؒ فرماتے ہیں کہ مرد و عورت کو ایک دوسرے کے لیے لباس کی تشبیہ دینے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ لباس جس طرح انسانی جسم کو سردی، گرمی اور دیگر مضرات سے بچاتا ہے اس کے عیوب اور نقائص کو چھپاتا ہے اسی طرح مرد اور عورت ایک دوسرے کو بہت سے مفاسد میں

---

[1] الذاریات: ۴۹

[2] البقرۃ: ۱۸۷

[3] امام فخر الدین رازی: تفسیر کبیر: ۵: ۱۱۶ طبع مصر ۱۳۵۷ھ / ۱۹۳۸ء

پڑ جانے سے بچاتے ہیں - اور ایک دوسرے کے لیے پردہ پوشی کا کام دیتے ہیں۔

تعلق زوجیت جب ایک فطری داعیہ قرار پایا تو شریعت نے اس کی کھلے دل سے اجازت دی صرف اجازت ہی نہیں بلکہ اسے سنت [۱] انبیاء قرار دیا گیا اور اس پر اجر و ثواب[۲] کا وعدہ فرمایا گیا۔

مقاصد نکاح مرد اور عورت کے درمیان طبعی اور فطری بے پایاں کشش آدمی کو ایک ایسے موڑ پر کھڑا کر دیتی ہے جہاں سے اس کے حق پرست اور بندۂ ہوا و ہوس ہونے کا بآسانی فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ ایک طرف جذبات اور ہیجان کی طوفان خیزی اسے ہر بندش کے توڑ پھینکنے پر آمادہ کرتی ہے تو دوسری طرف خدا کا خوف اور عقل و فطرت کے تقاضے اسے حدود کی پاسداری پر مجبور کرتے ہیں۔ یہ کش مکش آدمی کے دعویٰ ایمان کے لیے ایک کسوٹی بن جاتی ہے کہ کہاں تک وہ اپنے عزم و اعتقاد میں سچا ہے۔

ایک حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خطرہ سے یوں متنبہ فرمایا۔

ما ترکت بعدی فتنة اضر علی الرجال من النساء [۳]

میں نے اپنے بعد مردوں کے لیے عورتوں سے زیادہ نقصان دہ اور کوئی فتنہ نہیں چھوڑا

ایک دوسرے موقعہ پر ارشاد فرمایا۔

ما من صباح الا وملکان ینادیان ویل للرجال من النساء وویل للنساء من الرجال [۴]

ہر صبح دو فرشتے اعلان کرتے ہیں کہ مردوں کے لیے عورتیں تباہ کن ہیں اور عورتوں کیلئے مرد [۴]

کامیابی اسی شخص کے لیے ہے جو اس کش مکش میں عفت اور پاکبازی کا دامن نہ

---

[۱] ترمذی شریف: ۲۰۷ طبع نور محمد کراچی

[۲] مسلم شریف: ۱: ۳۲۴ طبع کویت

[۳] بخاری شریف: ۲: ۷۶۳ طبع کرزن پریس دہلی ۱۳۲۵ھ

[۴] سنن ابن ماجہ: ۲۹۷ طبع مجتبائی دہلی

چھوڑے اور جذبات کے اندھے بہرے تقاضے اس کو جادہ مستقیم سے منحرف نہ کریں۔

عفت و عصمت اور پاکدامنی اور طبعی جنسی خواہشات کی جائز تکمیل اور جنسی بے راہروی سے بچنے کیلئے شریعت نے ہر مسلمان مرد اور عورت کو تاکیدی حکم دیا کہ وہ ازدواجی زندگی کی ذمہ داریوں سے فرار کی کوشش نہ کرے بجز اس کے کہ کوئی معاشی یا جسمانی مجبوری لاحق ہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

یا معشر الشباب من استطاع منکم الباءة فلیتزوج فانہ اغض للبصر واحصن للفرج [۱]

اے گروہ نوجوانان! تم میں سے جو (عورت کی) ضروریات (گھر، نان، نفقہ وغیرہ) کو پورا کر سکتا ہو اسے ضرور شادی کر لینا چاہیئے کیونکہ رشتۂ ازدواج آنکھ کو نیچا کرنے والا (بدنگاہی سے محفوظ کرنے والا) اور شرم گاہ کو (برائی سے) بچانیوالا ہے۔

حدیث ہذا اور نکاح کے سلسلے کی آیات قرآنی سے مترشح ہوتا ہے کہ اسلام میں نکاح کا مقصد محض جنسی جذبات کی تسکین نہیں بلکہ نکاح کے دیگر متعدد دینی اخلاقی اور تعمیری و تربیتی مقاصد و فوائد اور مصالح ہیں۔ ورنہ یہ سنت انبیا کا درجہ نہ پاتا۔ قضائے شہوت تو ایک ضمنی چیز ہے۔ علامہ سرخسی نے مبسوط میں لکھا ہے۔

لیس المقصود بھذا العقد قضاء الشھوۃ وانما المقصود ما بیناہ من اسباب المصلحۃ ولکن اللہ تعالیٰ علق بہ قضاء الشھوۃ ایضاً لیرغب فیہ المطیع والعاصی، المطیع للمعانی الدینیۃ والعاصی لقضاء الشھوۃ الخ [۲]

ترجمہ اس عقد (نکاح) سے مقصود قضائے شہوت نہیں بلکہ مقصود دراصل وہ مصالح ہیں جن کو ہم بیان کر آئے ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ قضائے شہوت کو بھی معلق

---

[۱] بخاری شریف: ۲: ۷۵۸ طبع کرزن پریس دہلی ۱۳۲۵ھ

[۲] امام سرخسی: کتاب المبسوط: ۴: ۱۹۴ طبع مصر ۱۳۲۴ھ

کر دیا ہے تاکہ اس میں اطاعت گزار اور نافرمان، دونوں قسم کے لوگ رغبت رکھیں اطاعت گزار تو دینی مقاصد کی تکمیل و تحصیل کے لیے اور نافرمان قضائے شہوت کیلئے۔
قرآن مجید کی رو سے اسلامی قانون ازدواج یعنی نکاح کا اولین مقصد عفت و عصمت اور اخلاق کی حفاظت ہے۔ ارشاد ہوا:

وَاُحِلَّ لَکُمْ مَّا وَرَاءَ ذٰلِکُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِکُمْ مُّحْصِنِیْنَ غَیْرَ مُسٰفِحِیْنَ۔[1]

محرمات کے سوا باقی سب عورتیں تم پر حلال کر دی گئیں بشرطیکہ تم اپنے اموال کے بدلے میں ان کو حاصل کرنا چاہو، قید نکاح میں لانے کے لیے نہ کہ شہوت رانی کیلئے
سورۃ النساء کی آیت نمبر ۲۵ میں عورتوں کیلئے مُحْصنات کا لفظ استعمال ہوا۔ سورۃ المائدہ کی آیت ۵ میں پھر عورتوں کیلئے مُحْصَنٰتٍ اور مردوں کیلئے مُحْصِنِیْنَ کی قید لگائی گئی۔ ان آیات میں نکاح کو لفظ احصان سے تعبیر کیا گیا ہے اور لفظ احصان "حِصن" سے ماخوذ ہے جس کے معنیٰ قلعہ کے آتے ہیں اس طرح احصان کے معنیٰ قلعہ بندی کے ہوئے۔ جو مرد نکاح کرتا ہے وہ "محصن" ہے گویا وہ ایک قلعہ تعمیر کرتا ہے اور جس عورت سے نکاح کیا جاتا ہے وہ مُحْصَنَۃ یعنی اس قلعہ کی حفاظت میں آ گئی ہے جو نکاح کی صورت میں اس کے نفس اور اس کے اخلاق کی حفاظت کیلئے تعمیر کیا گیا ہے۔ یہ استعارہ صاف ظاہر کرتا ہے۔ کہ اسلام میں نکاح کا اولین مقصد اخلاق اور عصمت کا تحفظ ہے۔ یہ ایسا مقصد ہے جس کے لیے ہر دوسری غرض کو قربان کیا جا سکتا ہے مگر کسی دوسری غرض کے لیے اس کو قربان نہیں کیا جا سکتا۔ زوجین کے درمیان جب کبھی بھی اس مقصد کے فوت ہو جانے کا اندیشہ قوی ہو تو پھر شریعت سرے سے قید نکاح ہی کو ختم کرنے کا حکم دے دیتی ہے۔
قرآن مجید کی رو سے نکاح کا دوسرا اہم مقصد مرد اور عورت کی باہمی تسکین مودت

---

[1] النساء: ۲۴

ومحبت اور راحت ہے۔ ارشاد ہوا۔

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ اِلَيْهَا [1]

وہی ہے جس نے تم کو تن واحد سے پیدا کیا اور اس کے لیے خود اسی کی جنس سے ایک جوڑا بنایا تاکہ وہ اس کے پاس سکون حاصل کرے۔

ایک دوسری جگہ فرمایا:

خَلَقَ لَكُمْ مِنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَّرَحْمَةً [2]

اس (اللہ تعالیٰ) نے تمہارے لیے خود تم ہی میں سے جوڑے پیدا کیے تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو اور اس نے تمہارے (میاں بیوی کے) درمیان محبت اور رحمت پیدا کی ہے۔

میاں بیوی کا یہ باہمی سکون و راحت اور مودت و رحمت محض لذات کا سکون نہیں بلکہ یہ وہ بنیاد ہے جس کا وجود تمدن انسانی کے بالاتر مقاصد پورے کرنے کی قوت بہم پہنچانے کے لیے ضروری ہے۔ خانگی زندگی کی مسرت اور آرام و سکون کے باعث ہی انسان فضل و کمال کو حاصل کرتا اور اخلاق عالیہ کا مالک بنتا ہے۔

یہ نکاح کے دو بنیادی مقاصد تھے۔ جن پر کئی ایک دیگر دنیوی و اخروی منافع و فوائد متفرع ہوتے ہیں۔ امام غزالی [3] نے احیاء العلوم میں اور ابو زہرہ [4] مصری نے الاحوال الشخصیۃ میں نکاح کے فوائد اور مصالح و حکمتوں پر قدرے تفصیلاً بحث کی ہے۔

انہی ارفع مقاصد کی بنیاد پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح کو اپنی سنت قرار دیا اور

---

[1] الاعراف: ١٨٩

[2] الروم: ٢١

[3] احیاء العلوم: ٢: ٣١ - ٢٤ طبع قاہرہ

[4] الاحوال الشخصیۃ: ١٨ - ٢٠ طبع دار الفکر العربی

اس سنت پر عمل نہ کرنے والے سے اپنی لاتعلقی کا اظہار فرمایا[1] علاوہ ازیں متعدد روایات میں تبتل (ترک نکاح) سے سختی سے منع فرمایا[2]

نکاح انسانی زندگی میں

نکاح کے معاملے میں عورت کی آزادی اور رضامندی

انتہائی اہم موڑ اور ایک نئی زندگی کے آغاز کی حیثیت رکھتا ہے۔ دوسرے شریعت اسلامیہ میں نکاح ایک مستقل اور تادم زیست کا معاہدہ ہے جسے ناگزیر حالات ہی میں توڑا جا سکتا ہے۔ لہٰذا شریعت ایک عاقل بالغ مرد اور عورت کو اس بات کا پورا پورا حق دیتی ہے اور موقع فراہم کرتی ہے کہ وہ اس جاودانی معاہدہ سے قبل اچھی طرح غور و فکر کر لے، سوچ سمجھ لے، دیکھ بھال لے اور جانچ پرکھ لے کیونکہ اسے اپنے ساتھی کیساتھ پوری زندگی گزارنی ہے۔ لہٰذا زندگی بھر کا ساتھی ایسا ہونا چاہیئے جو اس کے لیے باعث سکون اور باعث رحمت ہو تاکہ کہیں اس کی زندگی خوشیوں کا گہوارہ بننے کی بجائے تلخیوں کا موجب نہ بن جائے۔

مرد تو اس انتخاب میں ہمیشہ سے مکمل اختیارات کا مالک چلا آیا ہے مگر عورت کی وہ پوزیشن نہ تھی۔ اسلام نے انتخاب زوج کے سلسلے میں عورت کو بھی پورا پورا اختیار دیا ہے۔ وہ اپنی مرضی اور رضامندی سے جس آدمی سے بھی شرعی حدود و قیود کی موجودگی میں نکاح کرنا چاہیے کر سکتی ہے۔ عزیز و اقارب حتیٰ کہ والد کو بھی اس بات کا حق حاصل نہیں کہ وہ اس پر اپنی مرضی کو ٹھونسے۔ جب تک عورت کی صریح اجازت نہ ہو اس وقت تک نکاح منعقد ہی نہیں ہوتا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا *

لا تنکح الایم حتی تستامر ولا تنکح البکر حتی تستاذن[3]

شادی شدہ عورت کا نکاح (بیوگی یا طلاق کے بعد) اس وقت تک نہیں کیا جائے گا جب تک کہ اس سے مشورہ نہ لے لیا جائے اور دوشیزہ کا نکاح بھی

---

[1] بخاری شریف: ۲: ۷۵۷، ۷۵۸

[2] امام ابو محمد عبداللہ الدارمی؛ سنن الدارمی: ۲: ۱۳۳ طبع دمشق

[3] بخاری شریف: ۲: ۷۷۱ طبع کرزن پریس دہلی

اس کی اجازت لیے بغیر نہیں کیا جائے گا۔

امام بخاری نے اس حدیث کا باب ہی "لاینکح الاب وغیرہ البکر والثیب الا برضاھا" کے عنوان سے باندھا ہے جس کا معنی ہے باپ یا کوئی اور ولی دوشیزہ اور خاوند دیکھی عورت کا نکاح اس کی رضامندی کے بغیر نہیں کرا سکتا۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے۔

لا یجوز نکاح احد علی بالغة صحیحة العقل من اب او سلطان بغیر اذنها بکرا کانت او ثیبا فان فعل ذالك فالنکاح موقوف علی اجازتها فان اجازته جاز وان ردته بطل [1]

کسی باپ یا بادشاہ کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ کسی دوشیزہ یا خاوند دیکھی عورت کا نکاح اس کی اجازت کے بغیر کر دے۔ اگر وہ ایسا کرے تو نکاح لڑکی کی اجازت پر موقوف ہے اگر وہ منظور کر لے تو فبہا ورنہ وہ نکاح باطل ہو جاتا (ٹوٹ جاتا) ہے۔

مسلم شریف کی حدیث میں ہے۔

الایم احق بنفسها من ولیها والبکر تستاذن فی نفسها واذنها صماتها [2]

شادی شدہ عورت (بیوگی یا طلاق کے بعد) اپنے نفس کی اپنے ولی سے زیادہ حقدار ہے اور دوشیزہ سے اس کے نفس (نکاح) کے معاملے میں اجازت طلب کی جائے گی اور اس کا خاموش رہنا ہی اس کی اجازت ہے۔

باکرہ لڑکی کی خاموشی کو اس لیے اجازت سمجھا گیا کہ اس میں حیا زیادہ ہوتی ہے اور عموماً زبان سے نہیں بولتی۔ پھر خصوصاً والد کے سامنے بولنا تو اور مشکل ہو جاتا ہے۔

جن روایات میں ولی کی اجازت یا موجودگی مذکور ہے وہ نابالغہ کے نکاح پر محمول

---

[1] فتاویٰ عالمگیری: ۱: ۲۸۷ طبع مصر ۱۳۱۰ھ

[2] مسلم شریف: ۱: ۴۵۵ طبع کویت ۱۳۸۸ھ

ہیں استحباباً واستحساناً۔ جس بالغہ عورت کو اپنی ذات، اپنے مال اور دیگر امور میں تصرف کا حق حاصل ہے اسے نکاح کے معاملے میں حق کیوں نہیں حاصل ہوگا۔

نابالغہ کا نکاح

نابالغ لڑکی یا لڑکے میں چونکہ سمجھ و فکر کی کمی ہوتی ہے۔ اپنے برے بھلے کی تمیز نہیں کر سکتے، ان کے عقود، خرید و فروخت معتبر نہیں ہوتے اس لیے شرعاً ان کا اختیار کامل ولی کو دیا گیا ہے۔ صغیرہ اور نابالغہ کے نکاح کے سلسلے میں بھی فقہاء کے نزدیک ولی کو ولایت اجبار حاصل ہے مگر یہ حق صرف باپ اور دادا کو حاصل ہے۔ کیونکہ ان سے بہت کم ہی توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ لڑکی کے منافع، اس کی مصلحتوں، ضروریات اور بھلائی کو پس پشت ڈال کر اپنے مصالح اور منافع کے لیے اس کو قربان کر دیں گے۔ ہدایہ میں ہے۔

لانهما كاملا الرأى وافرا الشفقة [1]

کیونکہ وہ دونوں (باپ دادا) پوری رائے (سمجھ) اور (لڑکی کے معاملے میں) بہت زیادہ شفیق ہوتے ہیں۔ لہٰذا ان کا کیا ہوا نکاح بعد از بلوغ بھی صحیح ہوگا۔

تاہم اگر یہ ثابت ہو جائے کہ باپ یا دادا نے چھوٹی بچی کی مصلحتوں کو پس پشت ڈال کر صرف اپنے منافع کو سامنے رکھا ہے تو یہ نکاح شرعاً صحیح نہیں ہوگا [2]

صغیرہ کا خیار بلوغ

باپ اور دادا جو اولاد پر انتہائی شفیق ہوتے ہیں اور جن کو ولایت تامہ حاصل ہوتی ہے اگر وہ چھوٹی لڑکی کے مصالح کو پس پشت ڈال دیں تو ان کا کیا ہوا نکاح بھی بعض صورت میں باطل ہو جاتا ہے تو ان کے سوا دوسرے رشتہ دار مثلاً چچا یا بھائی یا وہ جن کو ولایت بعیدہ حاصل ہوتی ہے اگر ایسا نکاح کر دیں تو بدرجۂ اولیٰ نکاح فسخ ہو سکے گا۔ مگر اس کے لیے ہمارے فقہاء

---

[1] ہدایہ: ۲: ۲۹۶ طبع افغانستان قندھار

[2] ا۔ المبسوط: ۴: ۲۲۴ طبع مصر ۱۳۲۴ھ

ب۔ لجنۃ احیاء التراث العربی: الاحکام الشرعیۃ فی الاحوال الشخصیۃ: ۲۱ طبع بیروت

نے ایک شرط لگائی ہے کہ آثار بلوغ (حیض وغیرہ) کے ظاہر ہوتے ہی لڑکی اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کر دے [1]

مسئلہ کفو اگرچہ تمام انسان مرد و عورت سب حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں اور اس اعتبار سے تمام اقوام اور افراد عالم بحیثیت انسان مساوی درجہ رکھتے ہیں لیکن اس کے باوجود نکاح کے مسئلے میں شریعت نے کفاءت (ہمسری) کو ملحوظ رکھا ہے اور غیر کفو میں نکاح کرنے کو نامناسب سمجھا ہے۔ کیونکہ شریعت یہ چاہتی ہے کہ ازدواجی تعلق ایسے مرد اور عورت کے درمیان قائم ہو جن کے درمیان، غالب حال کے لحاظ سے مودت ورحمت کی توقع ہو اور جہاں یہ توقع نہ ہو وہاں رشتہ کرنا مکروہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح سے قبل (منکوحہ بننے والی) عورت کو دیکھ لینے کا حکم (یا کم از کم مشورہ) دیا ہے [2]

نکاح کے بعد میاں اور بیوی دونوں کی خواہش ہوتی ہے کہ آپس میں موافقت، محبت و موانست رہے، دونوں کے میل ملاپ اتفاق و اتحاد سے خانگی امور کا انتظام ہو اور دونوں راحت و آرام کی زندگی بسر کریں۔ دوسرے یہ کہ سسرالی رشتہ داروں سے بھی کوئی بگاڑ نہ ہو بلکہ پرانی رشتہ داریوں اور محبت و مودت کے تعلقات کی از سر نو تجدید ہو۔ ایک دوسرے کے معاون، مددگار اور خوشی اور غمی کے شریک ہوں۔

یہ تمام مقاصد اسی وقت حاصل ہو سکتے ہیں جب کہ دونوں میاں بیوی کے مزاجوں میں مکمل یا قریب قریب ہم آہنگی ضرور ہو۔ اخلاق و عادات، خاندانی روایات اور طرز معاشرت کی خصلتیں ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہوں۔ اب چونکہ ہر خاندان، قبیلہ اور ہر برادری کے عادات و اطوار، طرز معاشرت اور مزاجوں میں قدرتی طور پر اختلاف ہوتا

---

[1] ا۔ فتاویٰ عالمگیری: ۱: ۲۸۵ طبع مصر ۱۳۱۰ھ
ب۔ ہدایہ: ۲: ۲۹۷ طبع قندھار

[2] ا۔ مسلم شریف: ۱: ۲۰۸ طبع کویت ۱۳۸۹ھ
ب۔ ترمذی شریف: ۱۷۵ طبع نور محمد کراچی

ہے۔ اس لیے ضرورت اس امر کی ہوئی کہ کفاءت کا لحاظ رکھا جائے تاکہ نکاح کے فوائد اتفاق و اتحاد اور مصالح مقتضیہ فوت نہ ہو جائیں۔

فقہائے احناف کے نزدیک کفاءت (ہمسری) کی بنیاد درج ذیل چھ چیزیں ہیں۔ اگر کفو کا اعتبار کیے بغیر کوئی ولی کسی نابالغہ کا یا بالغہ لڑکی خود اپنا نکاح غیر کفو میں کرے گی تو ہر دو صورتوں میں نابالغہ کو اور ولی کو اس بات کا اختیار ہوگا کہ وہ عدالت سے نکاح کو فسخ کرا سکے وہ چھ چیزیں یہ ہیں۔

نسب۔ اسلام۔ حریت۔ مال۔ دیانت۔ حرفت [1]

مہر

یہ عرض کیا جا چکا ہے کہ نکاح اسلام میں زوجین کے درمیان ایک مستقل معاہدہ ہے کیونکہ نکاح کا فائدہ تب ہی حاصل ہو سکتا ہے جب کہ یہ عقد مؤبد ہو۔ ہنگامی، عارضی اور وقتی تعلق سے وہ فوائد منزلیہ حاصل نہیں ہو سکتے جن کا حصول اول الذکر صورت میں متصور ہے۔ اسلام میں طلاق کا اختیار عورت کی بجائے مرد کو حاصل ہے۔ اب شریعت نے مرد کے اختیار طلاق کے بے جا استعمال کو روکنے کیلئے مہر کا تقرر فرمایا۔ کیونکہ جب مالی خسارہ اس کے پیش نظر رہے گا تو وہ عام حالات میں آمادہ طلاق نہ ہوگا۔

دوسرے یہ کہ انسانی فطرت ہے کہ جو چیز انسان کو مفت میں مل جائے اور اس کے حصول پر اسے کچھ خرچ نہ کرنا پڑے تو وہ عموماً اس کی قدر نہیں کرتا۔ لہٰذا شریعت نے انسانی فطرت کو سامنے رکھتے ہوئے عقد نکاح کو معزز اور باقدر و قیمت بنانے کے لیے مرد کے ذمہ مہر کو ضروری قرار دیا۔

تیسرے یہ کہ ایک عورت جب اپنے والدین کے گھر سے بیاہ کر اپنے مستقل ہمسفر زندگی کے گھر آتی ہے تو وہ بالکل ایک نئی زندگی کا آغاز کرتی ہے۔ جس میں اسے گھر بار بسانے کے لیے متعدد اشیاء کی ضرورت ہوتی ہے لہٰذا شریعت نے مرد کے اوپر لازم ٹھہرایا کہ وہ اس سلسلے میں عورت کی کچھ معاونت کرے تاکہ وہ گھریلو انتظام کو بحسن و خوبی اور بسہولت سرانجام

---

[1] ابوزہرہ: الاحوال الشخصیۃ: ۱۴۳ طبع دار الفکر العربی

دے سکے [1]

مہر مرد کی طرف سے ایک لازمی ہدیہ اور عورت کا ضروری حق ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوا:

وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَاءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسَافِحِيْنَ [2]

ان محرمات کے سوا باقی سب عورتیں تمہارے لیے حلال کی گئیں تاکہ اپنے اموال کے بدلے تم ان کو حاصل کرو۔ قید نکاح میں لانے کے لیے نہ کہ آزاد شہوت رانی کیلئے۔

ایک دوسری جگہ ارشاد ہوا:

وَآتُوا النِّسَاءَ صَدُقَاتِهِنَّ نِحْلَةً [3]

اور عورتوں کے مہر خوش دلی سے ادا کرو۔

پھر حکم ہوا:

وَآتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ [4]

اور مناسب طور پر ان کے مہر ادا کرو۔

فقہائے احناف کے نزدیک مہر واجب ہے اگرچہ بوقت نکاح مہر کا نام نہ بھی لیا گیا ہو (یعنی مقرر نہ کیا گیا ہو) نکاح بہرحال بدون ذکر مہر بھی صحیح ہو گا اور مہر مثل واجب ہو گا [5]

مہر جب عورت کا حق ہے تو وہ اپنے حق کو معاف بھی کر سکتی ہے۔ قرآن میں فرمایا گیا:

---

[1] محمد ابو زہرہ: الاحوال الشخصیۃ: ۷۷ طبع دار الفکر العربی

[2] النساء: ۲۴

[3] النساء: ۴

[4] النساء: ۲۵

[5] ہدایہ: ۲: ۳۰۴ طبع افغانستان

فَاِنْ طِبْنَ لَکُمْ عَنْ شَیْءٍ مِّنْہُ نَفْسًا فَکُلُوْہُ ھَنِیْٓـًٔا مَّرِیْٓـًٔا۔ [1]

پھر اگر وہ (عورتیں) خوش دلی کے ساتھ مہر میں سے کچھ معاف کر دیں تو اس کو مزے سے کھاؤ۔

مقدار مہر میں اختلاف کی بنا پر فقہاء میں بھی اختلاف ہوا ہے۔ فقہائے حنفیہ کے نزدیک مہر کی مقدار کم از کم دس درہم ہے [2]۔ جو رائج الوقت وزن کے اعتبار سے دو تولے اور تقریباً گیارہ ماشے بنتے ہیں۔ اگر درہم (چاندی) کے علاوہ کوئی چیز مہر قرار پائے تو اس کی قیمت بوقت عقد دس درہم چاندی سے کم نہ ہو۔

اور زائد مہر کے لیے شریعت نے کوئی حد مقرر نہیں فرمائی تاہم گنجائش سے زیادہ مہر کا مقرر کرنا اچھا نہیں ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ کا حکم ہے۔

خبردار! عورتوں کے مہر زیادہ نہ باندھو۔ اگر مہر کی زیادتی دنیا کے اعتبار سے بڑائی ہوتی یا تقرب الی اللہ کا سبب ہوتی تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس بات کے زیادہ مستحق تھے کہ آپ ایسا کرتے۔ مجھے نہیں معلوم کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی عورت سے اپنا نکاح کیا ہو یا اپنی صاحبزادیوں میں سے کسی کا نکاح کر دیا ہو اور بارہ اوقیہ سے زیادہ مہر باندھا ہو [3]۔ ایک اوقیہ چالیس درہم کا ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے بارہ اوقیہ کے ۴۸۰ درہم ہوئے۔

بہرحال مہر کی زیادتی عند الشرع پسندیدہ نہیں اور نہ یہ کوئی بڑائی کی بات ہے۔ علاوہ ازیں یہ مروت انسانی کے بھی تو خلاف ہے کہ جو رفیق حیات اور مونس و غمخوار بن رہا ہے اس پر مہر کا اس قدر بار لاد دیا جائے کہ وہ زندگی بھر ادا نہ کر سکے اور قرضے کا ایک عظیم بوجھ کاندھے پر رکھے رہے۔

وطی اور خلوت صحیحہ یا زوجین میں سے کسی کی موت سے مہر مؤکد ہو جاتا ہے اور اس

---

[1] النساء: ۴

[2] ہدایہ: ۲: ۳: ۳

[3] ترمذی شریف: ۷۹ اطبع نور محمد کراچی

کے بعد مقررہ مہر میں کمی نہیں ہو سکتی ۔ اگر مباشرت سے قبل ہی طلاق کی نوبت آگئی تو مقررہ مہر کا نصف مرد کے ذمہ ہوگا[1]۔

مہر میں ہر وہ چیز صحیح ہے جس پر مال متقوم کا اطلاق ہو سکتا ہو۔ یا جس چیز کو مال نہ کہا جا سکتا ہو مثلاً یہ کہ مرد اتنا عرصہ عورت کی خدمت کرے گا، سال بھر اس کی کھیتی باڑی کرے گا یا اسے (بیوی کو) حلال و حرام اور حج و عمرہ کے احکام کی تعلیم دے گا وغیرہ وغیرہ ۔ یہ چیزیں مہر کا بدل نہیں ہو سکتیں ۔ اگر یہ چیزیں مہر میں مقرر ہوئیں تو مہر مثل واجب ہوگا[2] یعنی اتنا مہر جتنا اس عورت کے قبیلہ والیوں کا عموماً باندھا جاتا ہے ۔ شغار (جسے پنجابی میں وٹہ سٹہ کہتے ہیں) یعنی ایک شخص اپنی لڑکی یا بہن کا نکاح دوسرے سے کردے اس شرط پر کہ وہ (دوسرا) اپنی لڑکی یا بہن کا نکاح اس سے کردے گا ۔ اور ہر ایک کا مہر دوسرا نکاح ہو تو ایسا کرنا شریعت میں گناہ ہے ۔ ایسی صورت میں مہر مثل واجب ہوگا[3]

مہر کی قسمیں

مہر کی دو قسمیں ہیں ۔ معجل اور مؤجل ۔ معجل وہ ہے جو خلوت سے قبل یا عند النکاح دینا قرار پایا ہو اور مؤجل وہ ہے جس کے لیے کوئی میعاد وقت مقرر ہو ۔ مہر معجل کی صورت میں عورت کو اس بات کا شرعاً حق حاصل ہے کہ وہ وصول کرنے تک اپنے نفس سے خاوند کو باز رکھ سکتی ہے ۔ اور شوہر کیلئے جائز نہیں کہ وہ عورت پر زبردستی کرے[4] اور اگر تمام کا تمام مہر مؤجل ہو تو پھر عورت کو یہ حق نہیں کہ وہ ایسا کرے[5]

---

[1] ا ۔ ہدایہ: ۲: ۳۰۴ طبع افغانستان

[2] فتاوی عالمگیری: ۱: ۳۰۲ طبع مصر
ب ۔ فتاوی عالمگیری: ۱: ۳۰۳

[3] ہدایہ: ۲: ۳۰۷ طبع افغانستان

[4] ہدایہ: ۲: ۳۱۳، فتاوی عالمگیری: ۱: ۳۱۷

[5] ایضاً

جہیز جہیز کے سلسلے میں قرآن وسنت سے کوئی صریح حکم یا ممانعت نہیں ملتی اس لیے والدین کی طرف سے رخصتی کے وقت اپنی لڑکی کو مناسب جہیز (جس میں نہ اسراف ہو، نہ قرض اٹھایا گیا ہو اور نہ نمائش وریا ہو) دینا مباح معلوم ہوتا ہے۔ ہمارے ملک میں والدین کی طرف سے جہیز کو لازم تصور کر لیا گیا ہے شرعی نقطۂ نگاہ سے ٹھیک نہیں۔ شریعت کسی نفس کو اس کی وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتی۔ جہیز کے لزوم ہی کا نتیجہ ہے کہ باپ حلال وحرام کی تفریق کیے بغیر پتہ نہیں کیا کیا گزرتا ہے۔ اس لیے مصلحت کا تقاضا ہے کہ اس رسم کو یا تو نہایت سادگی سے ادا کیا جائے یا سرے سے ختم ہی کر دیا جائے کیونکہ اس کے مفاسد اس کے مصالح سے زیادہ ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ حسنہ میں صرف حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کا جہیز ملتا ہے۔ مگر وہ بھی آنجناب نے اپنی گرہ سے نہیں دیا بلکہ حضرت علی المرتضیٰ رض کی زرہ فروخت کرا کر بنایا گیا ہے دوسرے وہ جہیز اتنا مختصر اور اتنا سادہ ہے کہ انسان حیران رہ جاتا ہے۔ اتنا کچھ بھی غالباً اس لیے فرمایا گیا کہ حضرت علی المرتضیٰ رض کو بالکل ایک نیا گھر بسانا تھا ورنہ باقی صاحبزادیوں کی رخصتی میں تو یہ چیز بھی نہیں ملتی۔

بہرحال والد نے اگر اپنی لڑکی کو جہیز میں کچھ دیا ہے اور وہاں عرف میں عاریتاً نہیں دیا جاتا ہو تو وہ واپسی کا مطالبہ نہیں کر سکتا[۱]۔ لڑکی والے اگر کچھ لیے بغیر نکاح یا رخصتی نہ کر دیتے ہوں تو خاوند اس کی واپسی کا مطالبہ کر سکتا ہے کیونکہ شرعاً وہ رشوت ہے[۲]۔ والد نے اپنی لڑکی کو جہیز دیا۔ بعد میں کہتا ہے کہ عاریتاً دیا تھا اور لڑکی یا اس کے مرنے کے بعد اس کا شوہر اس بات کا مدعی ہے کہ بطور تملیک دیا تھا۔ اب دیکھا جائے گا کہ اگر وہ ایسی چیز ہے جسے لوگ عموماً جہیز میں دیا کرتے ہیں تو پھر لڑکی یا اس کے شوہر کا قول مانا جائے گا اور اگر عموماً یہ بات نہ ہو بلکہ عاریتاً اور بطور

---

[۱] ابن عابدین: رد المحتار علی الدر المختار: ۲: ۳۷۵ طبع مصر ۱۳۲۳ھ

[۲] رد المحتار: ۲: ۳۷۶

تملیک دونوں طرح دینے کا رواج ہو تو اس کے باپ یا ورثاء کا قول معتبر ہوگا [۱]

کسی لڑکی نے اپنے ماں باپ کے مال سے اور اپنی دستکاری سے جہیز کے لیے کچھ سامان بنایا۔ اس کی ماں فوت ہوگئی اس کے باپ نے اس کی تیار کردہ اشیاء اسے جہیز میں دے دیں تو اس کے باقی بہن بھائیوں کو حق نہیں کہ وہ ماں کی طرف سے میراث کا دعویٰ کریں [۲] ماں نے بیٹی کے لیے اس کے باپ کے مال میں سے جہیز تیار کیا یا کوئی چیز جہیز میں اسے دے دی۔ باپ کو معلوم ہوا مگر خاموش رہا اور لڑکی رخصت کر دی گئی تو اب باپ اس جہیز کو لڑکی سے واپس نہیں لے سکتا [۳]

نفقہ ازدواجی زندگی کو زیادہ بہتر اور پرسکون بنانے کیلیے اسلام نے زوجین کے دائرہ عمل کی تقسیم فرما دی ہے۔ عورت کا کام عام حالات میں گھر کے اندر بیٹھ کر بچوں کی تربیت، گھر کی نگہداشت اور دیگر خانگی فرائض کو سرانجام دینا ہے۔ قرآن مجید میں امہات المومنین (حضورؐ کی ازواج مطہرات) کو حکم ہوا۔

وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ [۴]

اور اپنے گھروں میں قرار سے رہو۔

اور مرد کا کام کمانا اور اپنے اہل وعیال کے واسطے ضروریات زندگی فراہم کرنا ہے۔

قرآن مجید میں ارشاد ہوا۔

لِيُنْفِقْ ذُوْسَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ فَلْيُنْفِقْ مِمَّآ آتَاهُ اللّٰهُ [۵]

---

[۱] فتاویٰ عالمگیری: ۱: ۳۲۷ تنویر الابصار: ۶۲ طبع مصر

[۲] فتاویٰ عالمگیری: ۱: ۳۲۸

[۳] شمس محمد بن عبداللہ الحنفی: تنویر الابصار: ۶۲ طبع مصر

[۴] الاحزاب: ۳۳

[۵] الطلاق: ۷

وسعت والے کو (اپنے اہل پر) خرچ اپنی وسعت کے موافق کرنا چاہیئے - اور جس کی آمدنی کم ہو اسے چاہیئے کہ اسے اللہ نے جتنا دیا ہے اس میں سے خرچ کرے۔

ایک جگہ ارشاد ہوا۔

وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۔ [1]

اور جس کا بچہ ہے، اس کے ذمہ ہے ان (ماؤں) کا کھانا اور کپڑا، موافق دستور کے رہائش مہیا کرنے کے سلسلے میں حکم ہوا۔

اَسْكِنُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِنْ وُجْدِكُمْ [2]

ان کو اپنی حیثیت کے موافق رہنے کا مکان دو جہاں تم رہتے ہو۔

نفقہ سے مراد کھانا، پینا، کپڑا لتا، رہنے کا مکان اور دیگر ضروریات لازمہ ہیں۔ شرعی نقطۂ نگاہ سے بصورت نکاح صحیح بیوی کا نفقہ مرد کے اوپر واجب ہے بیوی چاہے مسلمان ہو یا، ذمیہ، غریب ہو یا امیر، بالغہ ہو یا نابالغہ بیوی نے جب اپنا آپ خاوند کے سپرد کر دیا ہے تو اب خاوند اس کی جملہ جائز ضروریات زندگی کا ذمہ دار ہے [3]

اگر بیوی نافرمان ہو کر خاوند کے گھر سے چلی جائے تو اس کا نفقہ خاوند پر واجب نہیں [4] اور اگر گھر سے باہر نہ نکلے تو اس صورت میں بھی خاوند پر نفقہ واجب ہے [5] اگر بیوی اتنی چھوٹی ہے کہ اس سے کسی قسم کا فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا تو اس کا نفقہ واجب نہیں [6]

خاوند کم سن ہو یا مقطوع الذکر ہو یا خصی ہو یا ایسا بیمار ہو کہ جماع پر قدرت نہ رکھتا ہو یا

---

[1] البقرہ، ۲۳۳

[2] الطلاق: ۶

[3] فتاویٰ عالمگیری: ۱: ۵۴۴

[4] فتاویٰ عالمگیری: ۱: ۵۴۵

[5] ایضاً

[6] ہدیہ: ۲: ۴۱۶

بالکل فقیر ہو تو بھی بیوی کا نفقہ اس پر واجب ہے۔ کیونکہ نفقہ کی علت متحقق ہے اور وہ بیوی کا اپنے آپ کو سپرد کر دینا ہے [۱]

خاوند کے گھر میں اگر بیوی بیمار ہو جائے تو اس کا علاج خاوند کے ذمہ ہے [۲]

کھانے پکانے کے جملہ ضروری برتن، سامان اور اثاث البیت (چارپائی، لحاف، تکیہ، چادر، دری، قالین وغیرہ) یوں ہی جسمانی طہارت و صفائی کیلئے ضروری اشیاء (صابن، تیل کنگھا وغیرہ) مرد کے ذمہ ہیں [۳] کھانا پکانا عورت پر قانوناً نہیں بلکہ استحساناً واجب ہے، اگر اگر کوئی عورت انکار کر دے تو قانوناً اسے مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ اسے پکا پکایا کھانا مہیا کرنا مرد کے ذمہ ہے [۴]

عورت اگر چائے یا حقہ و سگریٹ کی عادی ہو تو اس کا خرچ خاوند پر واجب نہیں [۵]

اسی پر پان، چھالیہ اور تمباکو وغیرہ کا قیاس کیا جائے گا جو عموماً بطور عادت استعمال ہوتی ہیں نہ کہ بطور غذا۔

سال میں کم از کم دو جوڑے کپڑے (ایک سردیوں کے لیے دوسرا گرمیوں کے لیے) بیوی کے لیے مرد پر واجب ہیں [۶]

خاوند پر یہ بھی واجب ہے کہ وہ بیوی کے لیے علیحدہ مکان مہیا کرے۔ جس میں اس کے خاندان کا کوئی دوسرا فرد نہ رہتا ہو۔ ہاں اگر عورت خود سے اپنے اس حق سے دستبردار ہو جائے

---

[۱] فتاویٰ عالمگیری: ۱: ۵۴۶

ب۔ ردالمحتار: ۲: ۶۶۲

[۲] فتاویٰ عالمگیری: ۱: ۵۴۶ (ب) ہدایہ: ۲: ۴۱۷

[۳] تنویر الابصار: ۸۴ (ب) فتاویٰ عالمگیری: ۵۴۸

ج الدرالمختار برحاشیہ ردالمحتار: ۲: ۶۶۶

[۴] فتاوی عالمگیری: ۱: ۵۴۸

[۵] ردالمحتار: ۲: ۶۶۶

[۶] ردالمحتار: ۲: ۶۶۷

اور خاوند کے گھر والوں کے ساتھ رہے تو وہ دوسری بات ہے [1]

خلاصہ یہ ہے کہ عورت کا نفقہ خاوند پر ہر حال میں واجب ہے۔ اگر وہ اس ذمہ داری کو ادا نہ کرے تو قانون اس کو ادا کرنے پر مجبور کرے گا اور بصورت انکار یا بصورت عدم استطاعت اس کا نکاح فسخ کر دے گا۔ (عورت از خود کل نفقہ یا بعض نفقہ نہ ملنے کے باوجود اپنے شوہر کے ساتھ قطع تعلق نہ کرنا چاہے تو یہ الگ بات ہے) ۔ البتہ نفقے کی مقدار اور قسم کا تعین عورت کی خواہشات پر مبنی نہیں ہے بلکہ مرد کی مالی حالت اور استطاعت پر ہے۔ ہمارے فقہاء نے اس مقام پر بڑی تفصیلات اور مختلف صورتیں لکھی ہیں جن کی یہاں گنجائش نہیں ہو سکتی۔ قرآن مجید نے اس بارے میں ایک قاعدہ کلیہ بیان کر دیا ہے کہ:

عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهُ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهُ [2]

مالدار پر اس کی استطاعت کے مطابق نفقہ ہے اور مفلس پر اس کی استطاعت کے مطابق۔

یہ نہیں کہ غریب آدمی سے وہ نفقہ وصول کیا جائے جو اس کی حیثیت سے زیادہ ہو یا مالدار وہ نفقہ دے جو اس کی حیثیت سے کم ہو۔

محرمات

انسان پیدا ہونے کے بعد سب سے پہلے اپنے ماں باپ بہن بھائیوں اور دوسرے قریبی رشتہ داروں سے آشنا ہوتا ہے۔ یہ انسان کا قریب ترین ماحول ہے جس میں وہ پھلتا پھولتا اور نشو ونما پاتا ہے۔ قدرت کا عطا کردہ یہ ماحول انسان کا بے لوث خادم ہوتا ہے۔ اس کے رنج و راحت اور خوشی و غم کو اپنا رنج و راحت اور خوشی و غم تصور کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان نے غیر شعوری طور پر اس ماحول کو ایک مقدس حرم کی حیثیت دے دی اور اس کے ساتھ انتہائی عقیدت اور محبت کے جذبات وابستہ کر دیئے۔

اس کا ایک بڑا فائدہ یہ نکلا کہ انسان جس دائرہ میں شب و روز رہتا اور زندگی گزارتا

---

[1] ہدایہ: ۲: ۴۲۰

[2] البقرہ: ۲۳۶

ہے وہ اخلاقی خرابیوں سے بڑی حد تک محفوظ ہوگیا ورنہ ایسے دائرہ میں میل جول اور اختلاط کی وجہ سے ہر طرح کی بے راہروی کے قوی امکانات موجود تھے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی[۱] نے لکھا ہے کہ اسلام نے جن رشتوں کو حرام قرار دیا ہے ان میں زیادہ تر دور جاہلیت ہی سے حرام چلے آتے تھے۔ اسلام نے ان میں چند اصلاحیں کرکے ان رشتوں کو اسی حال پر رکھا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ سورہ النساء کی آیت ۲۳ میں جن رشتوں کو حرام ٹھہرایا گیا ہے۔ ایک سلیم الفطرت انسان طبعی طور پر بھی ان کی رغبت نہیں کرسکتا۔ طبیعت سلیمہ ان سے جماع کا خیال تو کیا نظر بد بھی ان کی طرف اٹھانا گوارا نہیں کرتی بلکہ غلبہ و ہیجان شہوت کے وقت ان کا خیال و تصور بھی شہوت کے ٹھنڈا کر دینے کے لیے سرد پانی کا کام کرتا ہے۔

محرمات کے بیان میں فقہاء کے اندر چنداں اختلاف نہیں پایا جاتا۔ فقہ کی تمام مسلمہ کتب میں محرمات کی تفصیلات و جزئیات موجود ہیں میں یہاں عبدالرحمٰن الجزیری کی کتاب الفقہ علی مذاہب الاربعہ سے ایک اقتباس درج کررہا ہوں جو میرے خیال میں محرمات کے بیان کا نچوڑ اور خلاصہ ہے۔ چنانچہ علامہ موصوف لکھتے ہیں۔

نکاح کی متفق شرطوں میں سے ایک یہ ہے کہ جس عورت سے نکاح مطلوب ہے وہ عقد میں آنے کی صلاحیت رکھتی ہو جو عورتیں عقد کی صلاحیت رکھتی ہیں ان کے ساتھ عقد کرنا جن وجوہ کی بنا پر حرام ہوجاتا ہے ان کی دو قسمیں ہیں۔

ایک تو وہ وجوہ ہیں جن کی بنا پر عورت ہمیشہ کے لیے حرام ہوجاتی ہے۔

دوسری وہ وجوہ ہیں جن کی بنا پر عورت عارضی طور پر حرام ہوتی ہے جب حرام ہونے کی وجہ دور ہوجائے تو وہ پھر حلال ہوجاتی ہے۔

وہ وجوہ جن کی بنا پر کسی عورت کے ساتھ نکاح ہمیشہ کے لیے حرام ہوجاتا ہے تین ہیں: نسب شادی یا دودھ۔

نسب کی بنا پر تین قسم کی عورتیں دائمی طور پر حرام ہوجاتی ہیں۔ پہلی قسم میں اوپر اور

۱؎ حجۃ اللہ البالغہ (مترجم) ۲: ۵۴۷

نیچے (یعنی شاخ اور جڑ) کی نسبی عورتیں داخل ہیں۔ جڑ میں ماں جس کے پیٹ سے وہ پیدا ہوا اور وہ جو کسی جہت سے اس کی جدہ ہو خواہ باپ کی طرف سے ہو یا ماں کی طرف سے (یعنی دادی ہو یا نانی) اور اس سے اوپر۔ اور شاخ میں اس کی بیٹیاں، نواسیاں اور پوتیاں اور اس سے نیچے (یہ سب محرمات ابدیہ میں ہیں)

دوسری قسم ماں باپ کی شاخیں ہیں ان میں بہنیں ہیں خواہ کسی جہت سے ہوں حرام ہیں یعنی خواہ حقیقی بہن ہو یا باپ شریک یا ماں شریک ہو اسی طرح بہنوں کی بیٹیاں (یعنی بھانجیاں) اور ان کے بیٹوں یعنی بھانجوں کی بیٹیاں اور بھائی کی بیٹیاں یعنی بھتیجیاں اور بھتیجوں کی بیٹیاں اور ان سے نیچے کی اولاد۔

تیسری قسم دادا اور نانا کی شاخیں یعنی پھپیاں اور خالائیں خواہ وہ حقیقی ہوں یا سوتیلی۔ نسبی محرمات کی گنتی یہیں تک ہے۔ لہٰذا پھپی اور خالاؤں کی بیٹیاں حرام نہیں ہیں اور نہ چچا یا موں کی بیٹیاں اور دادی نانی کی شاخ میں بجز اس کے جو نسب میں پہلے درجہ پر ہے اور کوئی حرام نہیں ہے۔

شادی کے رشتہ سے بھی تین قسم کی عورتیں حرام ہیں۔

پہلی قسم اس عورت کی شاخ جس سے تخلیہ ہو چکا ہو۔ لہٰذا بیوی کی بیٹی سے جو اس کی (یا سوتیلی بیٹی) ہے شادی حرام ہے خواہ اس لڑکی کی کفالت (پرورش) اس نے کی ہو یا نہ کی ہو۔ اور اللہ تعالےٰ کے ارشاد میں جو فی حجورکم آیا ہے (یعنی وہ لڑکی جو خانہ پروردہ ہو) اس سے اس کی کیفیت کا بیان کرنا مقصود ہے۔ گویا اللہ تعالےٰ نے یہ فرمایا ہے کہ وہ بھی تمہاری بیٹی کی مانند ہے جیسے تم نے اپنے حجرہ (گھر) میں پالا ہے۔

اسی طرح ربیبہ کی بیٹی (سوتیلی نواسی) اور اس بیٹی کی بیٹی ہے بھی نیچے سے نیچے درجہ تک شادی حرام ہے لیکن اگر اس کی ماں سے صرف نکاح ہوا ہے اور تخلیہ نہیں ہوا تو وہ لڑکی حرام نہیں ہے۔

دوسری قسم بیٹی کی جڑ ہے لہٰذا نکاح کے ہوتے ہی بیوی کی ماں (ساس) اور اس کی

نانی (یعنی منیا ساس) اور داری (یعنی ددیا ساس) حرام ہوجاتی ہیں اگرچہ اس سے تخلیہ نہ ہوا ہو چنانچہ کہتے ہیں کہ بیٹی سے نکاح ہو تو اس کی ماں حرام اور ماں سے تخلیہ ہو تب بیٹی حرام۔ غالباً اس میں حکمت یہ ہے کہ بچپن کی حالت اور اوائل عمری میں لڑکی کا تعلق مرد کے ساتھ گہرا ہوتا ہے اور لڑکیاں مرد کے معاملہ میں بڑی غیرت مند ہوتی ہیں اس لیے چاہیئے کہ اس کے ساتھ عقد کرکے اس کی ماں سے تمام امیدیں منقطع کرلے تاکہ کسی قسم کا کینہ یا بغض ان کی محبت کے رشتہ کو نہ توڑ دے۔ بخلاف ماں کے کہ اس کے لیے آسان ہے کہ وہ اپنی بیٹی کی خاطر جس سے اسے سخت محبت ہے ایسے شخص کو نظر انداز کردے جو اس کا شریک حال نہیں ہے اور اس طرح اس کا بیٹی کے ساتھ جو علاقہ الفت ہے وہ نہیں ٹوٹتا۔

تیسری قسم میں وہ عورتیں ہیں جن سے باپ نے مباشرت کی ہو۔

اب رہا دودھ کا رشتہ۔ اس رشتہ سے وہ تمام عورتیں حرام ہوجاتی ہیں جو نسب سے حرام ہوتی ہیں۔ اس حکم سے بعض صورتیں مستثنیٰ ہیں جن کی تفصیل ان کے بیان میں آرہی ہے۔

یہ وہ صورتیں ہیں جو ہمیشہ کے لیے عورت کو حرام کو دینے کا موجب ہیں لیکن وہ وجوہ جن سے عارضی طور پر عورت حرام ہوتی ہے وہ چند امور ہیں۔

ایک امر رشتہ دار سے شادی ہے۔ چنانچہ یہ جائز نہیں ہے کہ دو بہنوں کو عقد ازدواج میں لائے یا ماں بیٹی یا اسی طرح کی اور دو عورتوں سے شادی کرے۔ اس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

دوسرے 'ملکیت' (یعنی مالک ہونا) لہٰذا عورت کے لیے حلال نہیں ہے کہ اپنے غلام سے شادی کرے اور نہ مرد کو حق ہے کہ وہ اپنی لونڈی سے شادی کرے جب تک کہ اسے آزاد نہ کردے۔

تیسرے 'شرک' یعنی کسی مسلمان کو مشرکہ عورت سے جو کسی آسمانی دین کی پیرو نہ ہو شادی کرنا حلال نہیں ہے۔

چوتھے تین طلاق (طلاق مغلظہ) جس سے وہ حرام ہوجاتی ہے تا آنکہ وہ کسی دوسرے سے شادی نہ کرلے (اور وہ شخص طلاق نہ دے دے یا وفات نہ پاجائے)

پانچویں کسی کے ساتھ وابستہ ہونا خواہ نکاح کے باعث وابستگی ہو یا عدت کے باعث

پس اگر حرام ہونے کی یہ وجوہ دور ہو جائیں تو وہ عورتیں پھر حلال ہو جائیں گی - اور ان وجوہ (مانع حلت۔ نکاح) میں چار بیویوں کا موجود ہونا یا چوتھی کا عدت میں ہونا ہے کہ پانچویں سے شادی حلال نہیں ہے [۱]

رضاعت کا لغوی معنی پستان سے دودھ چوسنا ہے مگر اصطلاح شرع میں اس
رضاعت : کے معنی کسی عورت کے دودھ کا ایسے بچے کے پیٹ میں جانا ہے جس کی عمر دو سال یعنی چوبیس ماہ (یا بقول امام ابوحنیفہ اڑھائی سال یعنی تیس ماہ) سے زیادہ نہ ہو [۲]

احناف کے نزدیک مدت رضاعت (اڑھائی سال) کے اندر جب بچہ کسی عورت کا دودھ پیتا یا چوستا ایک مرتبہ ہو یا زیادہ مرتبہ [۳] رضاعت ثابت ہوتی ہے رضاعت ثابت ہونے کا مطلب یہ ہے کہ سوائے چند مستثنیات کے وہ تمام رشتے حرام ہو جائیں گے جو نسب کی وجہ سے حرام ہوتے ہیں۔ مثلاً رضاعی ماں، رضاعی بہن، رضاعی خالہ، رضاعی پھوپھی، رضاعی بھتیجی، بھانجی وغیرہ کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

ان الرضاعة تحرم ما تحرم الولادة [۳]

رضاعت سے وہ تمام رشتے حرام ہو جاتے ہیں جو ولادت (نسب) سے حرام ہو جاتے ہیں -

مدت رضاعت (اڑھائی سال) کے بعد اگر کوئی بچہ کسی عورت کا دودھ پیتا ہے تو اس سے رضاعت ثابت نہیں ہوتی [۴]

جس عورت کے پستان سے بچہ نے دودھ پیا ہے وہ شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ، بالکل بوڑھی ہو یا نو سال کی ہو۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا حتی کہ اگر مردہ عورت کا دودھ پیا گیا تو

---

[۱] عبدالرحمٰن الجزیری: کتاب الفقہ علی مذاہب الاربعہ (مترجم) ۴: ۱۴۴ طبع محکمہ اوقات لاہور
[۲] ہدایہ ۲: ۳۲۹
[۳] مسلم شریف ۱: ۲۳۰
[۴] فتاویٰ عالمگیری ۱: ۳۴۳ (ب) ابن عابدین شامی: ردالمحتار ۲: ۴۱۴

بھی رضاعت ثابت ہوگی لے

ثبوت رضاعت کیلئے زمانہ کا ایک ہونا بھی ضروری نہیں - ایک پستان پر جتنے بچے جمع ہوں گے ان کے زمانہ رضاعت میں کتنا ہی فرق کیوں نہ ہو وہ سب کے سب ایک دوسرے کے رضاعی بہن بھائی ہوں گے ٢ے

نو سال سے کم لڑکی کے پستان میں اگر دودھ آجائے اور کوئی بچہ پی لے تو اس سے رضاعت نہیں آتی ٣ے

اگر مرد کے پستان میں دودھ آئے اور کوئی بچہ نوش کر لے تو اس سے بھی حرمت رضاعت نہیں آتی ٤ے

اگر دو بچے مل کر بکری یا کسی اور جانور کا تھن چوس لیں تو اس سے حرمت رضاعت نہیں آتی ٥ے

اگر کسی عورت کا دودھ پانی یا دوائی یا کسی جانور کے دودھ میں ملا کر دیا گیا تو عورت کا دودھ اگر پانی یا دوائی وغیرہ پہ غالب ہو تو حرمت رضاعت ثابت ہوگی ٦ے

عورت کا دودھ کھانے یا کسی دیگر غیر مائع چیز میں ملا کر دیا جائے تو اس سے رضاعت ثابت نہیں ہوتی ٧ے

نہ ہی بذریعہ حقنہ یا کان سے اندر پہنچانے سے حرمت ثابت ہوتی ہے ٨ے

لے ابن عابدین : ردالمحتار ۲ : ۴۱۳

٢ے فتاوی عالمگیری : ۱ : ۳۴۳

٣ے فتاوی عالمگیری : ۳۴۴

٤ے ایضاً

٥ے ہدایہ : ۲ : ۳۳۲

٦ے ردالمختار : ۲ : ۴۱۹

٧ے ردالمحتار مع درمختار : ۲ : ۴۲

٨ے ایضاً

اگر مرد نے اپنی بیوی کا پستان چوس لیا تو حرمت رضاعت نہیں آتی اگرچہ اندر دودھ بھی چلا جائے [۱]

رضاعت کے ثبوت کیلئے صرف عورتوں کی گواہی کافی نہیں بلکہ دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی سے حرمت رضاعت ثابت ہوگی [۲]

حضانت : حضانت کا لفظ حضن سے ماخوذ ہے جس کے معنیٰ "آغوش" کے ہیں۔ اسی سے حَاضِنَۃٌ اس عورت کو کہتے ہیں جو بچے کو اپنی آغوش میں پالتی ہے۔ اصطلاح شرع میں حضانت کے معنی صغیر سن بچے، عاجز، مجنون یا ہوش باختہ کو حتی المقدور مضرتوں سے بچانا اور اس کی اصلاح و تربیت مثلاً صاف ستھرا رکھنا کھلانا پلانا اور ضروریات راحت کا خیال رکھنا ہے [۳]

صغرسنی میں بچہ چونکہ والد کی بنسبت ماں کا زیادہ محتاج ہوتا ہے اور وہ زیادہ شفیق ہوتی ہے اس لیے شریعت نے بچے کی حضانت (تربیت) کا حق اولاً ماں کو دیا ہے چاہے وہ بچے کے باپ کے نکاح میں ہو یا اس سے جدائی ہو جائے۔ ہر دو حال میں وہ بچے کی زیادہ مستحق ہے [۴]

البتہ ماں اگر مرتد ہو جائے یا فاسقہ و فاجرہ ہو یا چور ہو یا گانا گاتی ہو یا نوحہ کرنے والی ہو یا بچے کے کسی غیر محرم سے نکاح کرلے تو ان صورتوں میں اسے حق پرورش حاصل نہیں [۵] کیونکہ ان صورتوں میں بچے کے اخلاق و اطوار بگڑنے کا قوی اندیشہ ہے۔ بعض فقہا نے تو یہ بھی لکھا ہے کہ اگر اس پر اللہ کی محبت اور خوف خدا اس قدر غالب ہو کہ بچے کی طرف دھیان نہ دے

---

[۱] ردالمحتار: ۲: ۴۲۴

[۲] ہدایہ: ۲: ۳۳۳ (ب) ردالمحتار: ۲: ۴۲۴

[۳] کتاب الفقہ علی مذاہب الاربعہ: ۴: ۱۰۸۹

[۴] ہدایہ: ۱: ۵۱۴

[۵] فتاویٰ عالمگیری: ۱: ۵۱۴

یا بے نماز ہو یا اکثر اوقات گھر سے باہر پھرتی رہتی ہو اگرچہ یہ باہر پھرنا گناہ کے لیے نہ ہو تو ان صورتوں میں بھی اسے حق حضانت حاصل نہیں۔

اگر ماں فوت ہو جائے یا پرورش سے انکار کر دے تو پرورش کے سلسلے میں ماں کے بعد بچے کی نانی یا پڑنانی کا حق ہے۔ نانی نہ ہو تو پھر دادی کا حق ہے دادی کے بعد بالترتیب سگی بہن، اخیافی بہن (ماں کی طرف سے)، اور علاتی بہن (صرف والد کی طرف سے) کا نمبر ہے۔ بہنوں کے بعد خالہ اور خالہ کے بعد پھوپھی کا حق ہے۔ مذکورہ عورتوں کو حق پرورش اسی وقت تک حاصل ہے جب کہ غیر شادی شدہ ہوں یا بچہ کے کسی محرم سے شادی کریں۔ غیر محرم سے شادی کرنے کی صورت میں ان کا حق حضانت ساقط ہو جائے گا۔[1]

ماں یا دیگر مذکورہ عورتوں کو اس وقت تک بچے کی تربیت کا حق حاصل ہے جب تک کہ وہ خود اپنے ہاتھ سے کھا پی نہ سکے کپڑے نہ پہن لے اور استنجا و طہارت وغیرہ کرنا سیکھ نہ لے بعض فقہاء نے نو سال کی عمر کا اندازہ بھی لگایا ہے۔ اور اگر لڑکی ہو تو جب تک بالغہ نہ ہو جائے۔[2]

بچے کے خاندان میں اگر کوئی عورت ایسی نہ ہو جو اس کی پرورش کر سکے تو پھر بالترتیب باپ، دادا، پردادا، سگا بھائی، باپ شریک بھائی، ماں شریک بھائی، سگا بھتیجا، سوتیلا بھتیجا، سگا چچا، سوتیلا چچا، پھر چچازاد۔ البتہ لڑکی ہو تو چچازادوں کے حوالے نہ کی جائے گی۔[3] حاضنہ کی اجرت بچے کے باپ کے ذمہ ہو گی۔[4]

بچے کی ماں اگر اس کے باپ کے نکاح میں ہے تو پھر تو کوئی مسئلہ ہی نہیں بصورت

---

[1] ہدایہ: ۲: ۴۱۳

[2] ہدایہ: ۲: ۴۱۴

[3] فتاویٰ عالمگیری: ۱: ۵۴۲

[4] ایضاً

جدائی اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اسی شہر میں رہے جہاں بچے کا باپ رہتا ہو۔[51]

بچہ ماں کے پاس ہو یا باپ کے پاس۔ دونوں ایک دوسرے کو بچے کی ملاقات سے منع نہیں کر سکتے۔[52]

طلاق

گزشتہ سطور میں عرض کیا چکا ہے کہ نکاح زوجین کے درمیان ایک مستقل معاہدہ ہے اور اس معاہدے سے کئی ایک دینی و دنیوی فائدے مقصود ہیں۔ وہ مقاصد و فوائد تبھی حاصل ہو سکتے ہیں جبکہ اس معاہدے کو مستقل بنایا جائے۔ اسلام میں اس معاہدے کو ہمیشہ قائم اور دائم رکھنے کے لیے زوجین کو مختلف طریقوں سے تعلیم و تربیت دی گئی ہے۔ اور انہیں بتایا گیا ہے کہ حتی الامکان اس عقد کو فسخ نہ کریں۔ مگر شریعت کی نگاہ میں یہ معاہدہ نکاح اتنا بھی مستحکم نہیں کہ اسے کسی حالت میں بھی ختم نہ کیا جا سکے اسلام میں نکاح عیاشی اور صرف جنسی خواہشات کی تکمیل کا ذریعہ نہیں بلکہ اس سے دیگر متعدد اعلیٰ واہم مقاصد مطلوب ہیں۔ زوجین کے باہمی اجتماع سے اگر وہ اہم مقاصد پورے ہوتے نظر نہ آئیں اور حدود اللہ اور قوانین الٰہیہ کے توڑے جانے کا خدشہ پیدا ہو تو پھر شریعت اس بات کی اجازت دیتی ہے کہ سرے سے اس معاہدہ کو ختم کر دیا جائے مگر یادر ہے۔ شریعت کی نگاہ میں یہ وہ آخری حربہ ہے جس کے بغیر کوئی چارہ کار نہ تھا۔ اگر اتنی بھی اجازت نہ دی جاتی تو یہ فطرت کے خلاف ہوتا جو روح شریعت کے منافی ہے۔ پھر یہ کہ اس ناگزیر حربے کو بھی پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا گیا بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ابغض الحلال الی اللہ عزوجل الطلاق[53]

---

[51] ایضاً

[52] ردالمحتار: ۲: ۶۶۰

[53] سلیمان بن اشعث: سنن ابی داؤد: ۱: ۲۹۶ طبع کانپور

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کے ہاں حلال چیزوں میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ چیز طلاق ہے۔ دوسرے یہ کہ معاہدہ نکاح کو ابدی بناتے اور زوجین کے انتہائی فوائد و منافع کا لحاظ رکھتے ہوئے احتیاطی تدابیر یہ کی گئیں کہ اسلام میں طلاق کا اختیار مرد کو دیا گیا۔ چونکہ مرد نسبتاً زیادہ سوچ کر قدم اٹھانے والا اور بردبار ہوتا ہے دوسرے اپنا مال خرچ کر کے حقوق زوجیت حاصل کرتا ہے اس لیے ان حقوق سے دستبردار ہونے کا اختیار بھی اسی کو دیا گیا ہے عورت کو اختیار نہیں دیا جا سکتا تھا۔ کیونکہ۔

اگر وہ طلاق کی مختار ہوتی تو مرد کا حق ضائع کرنے پہ دلیر ہو جاتی۔ ظاہر ہے۔ جو شخص اپنا روپیہ صرف کر کے کوئی چیز حاصل کرے گا وہ اس کو آخری حد تک رکھنے کی کوشش کرے گا اور صرف اس وقت اسے چھوڑے گا جب اس کے لیے چھوڑنے کے سوا کوئی چارہ کار نہ ہوگا۔ لیکن اگر صرف کرنے والا ایک فریق ہو اور ضائع کرنے کا اختیار دوسرے فریق کو مل جائے تو اس دوسرے فریق سے یہ امید کم کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے اس اختیار کے استعمال میں فریق اول کے مفاد کا لحاظ کرے گا جس نے مال صرف کیا ہے مرد کو طلاق کو اختیار دینا نہ صرف اس کے جائز حقوق کی حفاظت ہے۔ بلکہ اس میں یہ مصلحت بھی مضمر ہے کہ طلاق کی کثرت نہ ہو"[ل]

اقسام طلاق : طلاق کا معنی ہے فوراً یا مآل (انجام) کے اعتبار سے قیدِ نکاح کو اٹھا دینا۔ فقہاء نے عموماً دو طرح سے طلاق کی تقسیم بیان کی ہے۔ ایک تو وقت اور عدد اور طریقِ کار کے اعتبار سے تقسیم ہے۔ اور دوسری الفاظ طلاق اور نیت طلاق کے اعتبار سے۔

وقت اور طریقِ کار کے لحاظ سے طلاق کی تین قسمیں ہیں۔

احسن۔ حسن۔ بدعی

ل مولانا مودودی؛ حقوق الزوجین؛ ۴۹ طبع لاہور

ب۔ محمد ابوزہرہ: الاحوال الشخصیۃ: ۳۰۲ طبع دار الفکر العربی (قدرے تغیر کے ساتھ)

طلاق احسن: یہ ہے کہ آدمی اپنی بیوی کو صرف ایک طلاق دے ایسے طُہر (وہ ایام جن میں ماہواری نہیں آتی) میں جس میں اس سے مجامعت نہ کی گئی ہو۔ پھر اسے چھوڑے رکھے یہاں تک کہ عدت (تین حیض) گزر جائے۔

طلاق حسن: اسے طلاق سنت بھی کہا جاتا ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ آدمی تین طُہروں میں تین طلاقیں دے۔ یعنی ہر طُہر میں ایک طلاق۔

طلاق بدعی: یہ ہے کہ ایک ہی وقت میں تین طلاقیں دے دی جائیں ایک ہی لفظ کے ساتھ مثلاً تجھے تین طلاق یا الگ الگ مثلاً تجھے طلاق طلاق طلاق۔ احناف کے نزدیک ایسی طلاق واقع ہو جاتی ہے۔ اگرچہ ہے گناہ۔[۵۱]

الفاظ طلاق اور نیتِ طلاق کے اعتبار سے بھی طلاق کی تین قسمیں ہیں رجعی۔ بائن۔ مغلّظہ

طلاق رجعی: یہ ہے کہ صریح (واضح) الفاظ کے ساتھ ایک یا دو مرتبہ طلاق دی جائے۔ اپنی بیوی کو صریح الفاظ کے ساتھ طلاق کہنے میں خاوند کی نیت ہو یا نہ ہو بہر صورت طلاق واقع ہو جاتی ہے۔[۵۲]

مولانا امجد علی نے صریح الفاظ کے ساتھ طلاق دینے کی ایک سو چالیس صورتیں بنائی ہیں[۵۳]

طلاق رجعی تعلقِ نکاح کو فی الفور ختم نہیں کرتی بلکہ شرعاً اس میں گنجائش ہوتی ہے کہ زوج عدت کے دوران اپنی بیوی سے رجوع کر لے۔ رجوع کرنے میں بیوی کی رضامندی بھی ضروری نہیں۔ اور رجوع یہ ہے۔ کہ یا تو زبانی کہہ دے کہ میں نے اپنی بیوی سے رجوع کر لیا ہے۔ یا اس کے ساتھ مجامعت کر لے، یا اس کا بوسہ لے لے

---

۵۱ ہدایہ: ۲: ۳۳۳-۳۳۴

۵۲ ہدایہ: ۲: ۳۳۸

۵۳ مولانا امجد علی رضوی: بہار شریعت: ۸: ۹تا۱۴
طبع شیخ غلام علی لاہور

یا شہوت کے ساتھ اسے مس کرے۔ یہ اعمال گویا اس بات کی علامت ہیں کہ اس نے اپنے فیصلہ طلاق سے رجوع کر لیا ہے اور دوبارہ اپنی زوجہ کو اپنے نکاح میں رکھنے پر رضامند ہے۔ طلاق رجعی میں نکاح ثانی کی بھی ضرورت نہیں ہوتی [۱]

طلاق بائن

یہ ہے کہ صریح الفاظ (مادہ ط، ل، ق سے مشتق الفاظ) کے علاوہ ایسے الفاظ کنایۃً استعمال کرے جن میں طلاق اور عدم طلاق دونوں معنیٰ کا احتمال ہو۔ ایسے الفاظ کہتے ہیں طلاق کی نیت ہونا یا ایسی صورت حال کا ہونا ضروری ہے جو طلاق پر دلالت کرتی ہو [۲]

کنایہ کے الفاظ مثلاً جا، نکل جا، گھر خالی کر، اپنی راہ لے، تو مجھ سے جدا ہے، میں نے تجھے آزاد کیا وغیرہ ایکسواکیس کے قریب ہیں [۳]

طلاق بائن کی صورت میں سلسلہ نکاح منقطع ہو جاتا ہے۔ زوجین اگر دوبارہ ایک دوسرے کے ساتھ رہنے پر رضامند ہوں تو عدت یا عدت گزرنے کے بعد نکاح ثانی ضروری ہوگا۔

طلاق مغلّظہ

طلاق مغلّظہ اور طلاق بدعی ایک ہی چیز ہے۔ یعنی ایک ہی طہر میں تین مرتبہ صریح طلاق دے دی جائے [۴]

ایسی طلاق کا حکم یہ ہے کہ عورت جب تک زوج ثانی کا منہ نہ دیکھ لے اس وقت سابق خاوند کی زوجیت میں دوبارہ نہیں آسکتی۔ شریعت کی اصطلاح میں اسے "تحلیل" کہتے ہیں۔

طلاق دہندہ کے واسطے ضروری ہے کہ وہ عاقل اور بالغ ہو۔ بچہ کی اور مجنون ....

---

[۱] ہدایہ: ۲: ۳۷۳

[۲] ہدایہ: ۲: ۳۵۲

[۳] مولانا امجد علی: بہار شریعت: ۸: ۷ اناؤ اطبع لاہور۔

[۴] فتاویٰ عالمگیری: ۱: ۳۴۹

کی طلاق واقع نہیں ہوتی [۵۱]

فقہائے احناف کے نزدیک مُکرَہ (جسے مجبور کیا گیا ہو) اور سُکران (جو عمداً شراب پینے کی وجہ سے بیہوش ہوگیا ہو) اس کی طلاق واقع ہوجاتی ہے [۵۲]

طلاق سنجیدگی سے دی جائے یا ہنسی مذاق میں دی جائے یا یوں ہی زبان سے نکل جائے۔ تمام صورتوں میں واقع ہوجاتی ہے [۵۳] خاوند چونکہ طلاق دینے کا مالک ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں اسے طلاق کا اختیار ہے۔ لہٰذا وہ یہ اختیار کسی دوسرے کے سپرد بھی کرسکتا ہے [۵۴]

لفظ طلاق زبان سے نہ کہے بلکہ بیوی کو مخاطب کرتے ہوئے الفاظ طلاق لکھ کر بیوی کی طرف بھیج دے تو بھی طلاق واقع ہوجائے گی۔ [۵۵]

خلع: یہ عرض کیا جاچکا ہے کہ بعض مصالح کے پیش نظر طلاق کا اختیار اسلام میں مرد کو حاصل ہے۔ تاہم اسلام میں اس بات کی بھی گنجائش ہے کہ اگر عورت کا بوجوہ مرد کے پاس گزارا مشکل ہوجائے، رشتۂ زوجیت کے قائم رکھنے میں عورت کا نقصان اور اس کی حق تلفی ہوتی ہو اس کی عزت اور آبرو خطرہ میں ہو۔ اور حدود اللہ قائم نہ رہ سکتی ہو۔ تو عورت سراسر بے بس اور مجبور محض نہیں کہ ہمیشہ مظلومیت کی زندگی بسر کرے اور شوہر کے مظالم اور بے توجہی کا شکار رہے۔ بلکہ اسے یہ حق دیا گیا ہے کہ وہ اپنے خاوند کو کچھ مال دے دلا کر اس سے طلاق حاصل کرلے۔ البتہ اتنی بات ضرور ہے۔ کہ طلاق کی طرح یہ خلع بھی آخری چارہ کار کے طور پر استعمال کیا جائے۔ ورنہ شریعت کی نگاہ میں یہ بہت بڑا اخلاقی جرم ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم

---

[۵۱] فتاویٰ عالمگیری: ۱: ۳۴۹

[۵۲] ہدایہ: ۲: ۳۳۷

[۵۳] ایضاً

[۵۴] فتاویٰ عالمگیری: ۱: ۳۵۳

[۵۵] محمد ابو زہرہ: الاحوال الشخصیۃ: ۳۱۱

[۵۶] الاحوال الشخصیۃ: ۳۱۵

نے فرمایا:

ایما امرءۃ اختلعت من زوجھا من غیر بأس لم ترح رائحۃ الجنۃ [1]

ترجمہ: جس عورت نے بلا وجہ اور بلا ضرورت اپنے خاوند سے خلع کیا وہ جنت کی خوشبو بھی نہ سونگھے گی حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے لکھا ہے کہ خلع فی الحقیقت کوئی قابل ستائش چیز نہیں بلکہ قبیح چیز ہے۔ بایں ہمہ بعض اوقات ضرورۃً خلع کرنا لازمی ہوتا ہے [2]

خلع کا لفظی معنی جسم سے کپڑا وغیرہ اتار پھینکنا ہے اور اصطلاح شرع میں کچھ معاوضہ لے کر ملک نکاح کو بلفظ خلع کیساتھ زائل کرنا ہے۔[3] خلع کا باعث اگر خود خاوند کی طرف سے ہو تو خاوند کو بیوی سے کچھ لینا مکروہ ہے۔ اور اگر خلع کا باعث عورت ہی کی طرف سے ہو تو بلا کراہت جائز ہے [4] خلع سے فقہاء احناف کے نزدیک طلاق بائن واقع ہوتی ہے [5] خلع ایک قسم کی بیع ہے۔ جب تک میاں بیوی دونوں کی طرف سے ایجاب وقبول مکمل نہ ہو۔ اس وقت تک خلع نہیں ہوتا [6] جب خلع کی پیش کش مرد کی طرف سے ہو تو عورت کے اسی مجلس میں قبول کرنے سے قبل رجوع نہیں کر سکتا۔ اور اگر عورت بلا قبول کیے اس مجلس سے اٹھ جائے تو رجوع کر سکتا ہے [7] اور اگر خلع کی پیشکش عورت کی طرف سے ہو تو وہ مرد کے قبول کرنے سے پہلے پہلے رجوع کر سکتی ہے [8]

---

[1] جامع ترمذی: ۱۹۱ طبع نور محمد کراچی

[2] حجۃ اللہ البالغہ (مترجم) ۲: ۲۸۷ طبع لاہور

[3] حاشیہ ہدایہ: ۲: ۳۸۳ بحوالہ عنایہ شرح ہدایہ

[4] فتاویٰ عالمگیری: ۱: ۴۸۸

[5] ایضاً

[6] الاحوال الشخصیہ: ۳۵۱

[7] ایضاً

[8] ایضاً

جو چیز مہر بن سکتی ہو وہ بدل خلع بھی بن سکتی ہے [1] جس طرح طلاق میں طلاق دہندہ (شوہر) کا عاقل بالغ ہونا شرط ہے اسی طرح خلع میں بھی شرط ہے کیونکہ یہ بھی ایک قسم کی طلاق ہے۔

جس قدر مال پر خلع ہوا ہے وہ عورت پر لازم ہوگا [2]

ظہار: ظہار کا لفظ ظہر سے ماخوذ ہے جس کے معنی پیٹھ یا سواری کے ہوتے ہیں — اصطلاح شرع میں اس سے مراد کسی مسلمان خاوند کا اپنی بیوی (کتابیہ ہو یا چھوٹی ہو یا بڑی ہو) کو یا اس کے کسی عضو (جس سے پورا انسان مراد لیا جاتا ہو) کو محرّمات ابدیہ (وہ عورتیں جن سے ہمیشہ کے لئے نکاح حرام ہے۔ بوجہ نسب کے یا رضاعت کے یا مصاہرت کے) یا ان کے کسی عضو (مثلاً پیٹھ، ران، پیٹ وغیرہ) سے تشبیہ دینا ہے [3]

دورِ جاہلیت میں ظہار کا رواج تھا اور اس سے مقصود ایسی طلاق ہوتی تھی جس میں رجوع کی گنجائش نہ ہو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ اقدس میں بعض صحابہ سے بھی یہ چیز سرزد ہوگئی تو قرآن مجید میں سورۃ المجادلۃ کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں جن میں جاہلیت کی اس رسم یا قانون کے خاتمہ کا اعلان کیا گیا۔ اور واضح فرمایا گیا کہ تمہاری مائیں وہی ہیں ۔ جنہوں نے تم کو جنم دیا ہے۔ یا تمہیں دودھ پلایا ہے یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات ہیں۔ ان کے علاوہ کوئی عورت محض تمہارے کہنے سے تمہاری ماں نہیں بن جاتی۔ خصوصاً وہ عورت جس سے تم تعلق زوجیت بھی قائم کر چکے ہو البتہ اس کے یہ الفاظ کہنے پر شریعت نے ہلکی سی سزا مقرر فرمائی تاکہ آئندہ کے لیے وہ ایسی جرأت نہ کر سکے۔

ظہار کے لیے ضروری ہے۔ کہ خاوند اپنی بیوی کو اپنی محرمات عورتوں کے کسی عضو سے تشبیہ دے اگر اپنے باپ یا بیٹے یا دوسرے مرد محارم سے تشبیہ دی تو یہ ظہار نہ

---

[1] ہدایہ: ۲: ۳۸۴

[2] ہدایہ: ۲: ۳۸۳

[3] الدر المختار بر حاشیہ رد المحتار: ۲: ۵۸۹

ہوگا[1]

اگر اپنی بیوی سے کہا انت علی کظھر امی (تو میرے اوپر ایسے ہی حرام ہے جیسے میری ماں کی پیٹھ) تو ظہار ہی ہوگا اگرچہ طلاق کی نیت کرے[2]

مذکورہ عضو کے علاوہ کسی اور عضو سے تشبیہ دے تو مظاہر (ظہار کرنے والے) کی نیت پر موقوف ہے۔ ظہار کی نیت ہے تو ظہار اور طلاق کی نیت ہے تو طلاق مگر طلاق بائن ہوگی[3]

ظہار میں ضروری ہے۔ کہ مظاہر (ظہار کرنے والا) کفارہ کا اہل ہو۔ چنانچہ ذمی یا نابالغ یا مجنوں کا ظہار کرنا ٹھیک نہیں ہوگا[4]

ظہار کرنے کی صورت میں اس وقت تک بیوی سے نہ مجامعت کر سکتا ہے نہ اس کا بوسہ لے سکتا ہے اور نہ شہوت سے اسے مس کر سکتا ہے جب تک کہ کفارہ نہ ادا کرلے[5]

ظہار کا کفارہ ایک غلام (مسلم ہو یا غیر مسلم، مذکر ہو یا مؤنث، چھوٹا ہو یا بڑا) آزاد کرنا ہے اور اگر غلام نہ پا سکے (جیسا کہ آج کل ہے۔) تو دو مہینے متواتر روزے رکھے۔ ان دو مہینوں میں نہ عیدین آئیں نہ ایام تشریق۔ تو اتر ہر حال میں لازمی ہے۔ اگر کسی وجہ سے درمیان میں روزہ ترک کر دیا تو نئے سرے سے دو ماہ کے روزے رکھنا ہوں گے۔ اگر روزوں کی بھی استطاعت نہ ہو تو ساٹھ مسکینوں کا دو وقت کا کھانا ہے۔ اتنا کھانا کہ سیر ہو کر کھائیں۔ یا ہر مسکین کو قریباً دو سیر گندم (نصف صاع) یا اس کی قیمت مہیا کرنا ہے۔ اگر ایک ہی مسکین کو ساٹھ روز تک دن رات کھلایا تو بھی ٹھیک ہے[6]

---

[1] ایضاً: ۲: ۵۹۰

[2] ہدایہ: ۲: ۳۸۸

[3] ہدایہ: ۲: ۳۸۹۰

[4] فتاویٰ عالمگیری: ۱: ۵۰۶

[5] ایضاً

[6] ہدایہ: ۲: ۳۹۰ تا ۳۹۳

لعان: لِعان کا لغوی معنی ہانکنا اور دور کرنا ہے اصطلاح شرع میں اس سے مراد وہ چار حلفیہ شہادتیں ہیں جو میاں بیوی ایک دوسرے کے خلاف دیتے ہیں اور ایک شہادت میں لفظ لعنت بھی ہوتا ہے۔ مرد کی شہادت حد قذف کے قائم مقام اور عورت کی شہادات حد زنا کے قائم مقام تصور کی جاتی ہیں۔ [1]

جب شوہر اپنی محصنہ بیوی پر بالفاظ صریح زنا کی تہمت لگائے یا اس عورت سے ہونے والی اولاد کے متعلق کہے کہ یہ اس (مرد) کی نہیں تو ان صورتوں میں لعان واجب ہوتا ہے۔ جس کا ذکر قرآن مجید کی سورۃ النور کی آیت ۶ تا ۹ میں کیا گیا ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ قاضی کے روبرو پہلے مرد چار مرتبہ حلفیہ شہادت دے کہ وہ اپنے دعویٰ میں سچا ہے اور پانچویں مرتبہ کہے کہ اگر وہ اپنے دعویٰ میں جھوٹا ہو تو اس پر خدا تعالیٰ کی لعنت ہو۔ اس کے بعد اس کی بیوی چار مرتبہ حلفیہ گواہی دے کہ وہ (اس کا خاوند) جھوٹا ہے اور پانچویں مرتبہ کہے کہ مجھ پر خدا کا غضب ہو اگر وہ (خاوند) سچا ہو۔ اس کے بعد قاضی ان دونوں کے درمیان ہمیشہ کے لیے تفریق کر دے گا۔ لعان کے بعد وہ کبھی بھی رشتہ زوجیت میں منسلک نہیں ہو سکتے [2]

اگر خاوند لعان سے گریز کرے تو اس کو قید کر دیا جائے گا یہاں تک کہ لعان کرے یا اپنے جھوٹے ہونے کا اقرار کرے۔ جھوٹ کے اقرار میں اس پر حد قذف ہو گی [3]

جس بیوی پر تہمت زنا لگا رہا ہے اس کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ محدود فی القذف نہ ہو اور نہ ہی بالکل بچی یا پاگل یا زانیہ ہو [4]

بیوی پر تہمت زنا لگانے والے کے لیے یہ بھی ضروری کہ وہ عاقل بالغ ہو اگر

---

[1] الدر المختار بر حاشیہ رد المحتار: ۲: ۶۰۱

[2] (ا) ہدایہ: ۲: ۳۹۷

[3] ایضاً

[4] ایضاً

(ب) فتاویٰ عالمگیری: ۱: ۵۱۶

میاں بیوی دونوں یا ان میں سے ایک گونگا ہو تو لعان نہ ہوگا۔[1]

بچے کی نفی وہی معتبر ہے جو پیدائش کے سات دن کے اندر اندر ہو یا بوقت ولادت ہو۔ بعد کی نفی کا اعتبار نہ ہوگا۔[2]

شوہر اگر ایک سے زیادہ مرتبہ تہمت زنا لگائے تو ایک ہی مرتبہ لعان ہوگا۔[3]

بیوی پر اگر لواطت کی تہمت لگائی تو نہ لعان ہے نہ حد۔[4]

بخاری شریف جلد ثانی کتاب الطلاق میں لعان کے سلسلے میں جو احادیث آتی ہیں۔ ان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ

ا ۔ لعان قاضی کے سامنے ہی ہو سکتا ہے عورت اور مرد آپس میں یا اپنے عزیزوں کے سامنے لعان نہیں کر سکتے اور نہ ہی ایسے لعان سے تفریق ہو سکتی ہے۔

ب ۔ لعان سے قبل قاضی عورت اور مرد دونوں کو موقع دے گا کہ ان میں سے کوئی ایک قصور کا اعتراف کرلے۔ (ظاہر ہے ان میں سے ایک تو لامحالہ جھوٹا ہے جب دونوں اپنی بات پر اصرار کریں تب لعان ہے۔

ج ۔ فریقین کی طرف سے لعان کا فعل تمام ہونے کے بعد خود بخود تفریق نہیں ہو جائے گی بلکہ قاضی ان کے درمیان تفریق کا اعلان کرے گا۔

د ۔ لعان سے پیدا شدہ تفریق ابدی ہے۔ اس معاملہ میں "تحلیل" کا قانون بھی نہیں جاری ہوتا۔

ایلاء ایلاء لغۃً باب افعال کا مصدر ہے جس کا معنی قسم اٹھانا ہے۔ اصطلاح شرع میں اس سے مراد مرد کا اس بات پر قسم اٹھانا ہے کہ وہ چار ماہ یا اس زیادہ

---

[1] الدر المختار بر حاشیہ رد المحتار: ۲: ۶۰۶

[2] ایضاً: ۲: ۶۰۷

[3] فتاویٰ عالمگیری: ۱: ۵۱۴

[4] ایضاً

عرصہ اپنی بیوی کے قریب نہ جائے گا (جماع نہ کرے گا۔) [1]

اہل جاہلیت کی ایک رسم یہ بھی تھی کہ بعض اوقات غصہ میں آکر یا عورت کو محض تنگ کرنے کی خاطر قسم کھا لیتے کہ میں عمر بھر اپنی بیوی سے ہمبستر نہیں ہوں گا اور کبھی ایک طویل مدت کے لیے اس طرح کی قسم کھا لیتے۔ عورتوں کے حق میں یہ سراسر ظلم تھا۔ نہ تو انہیں بیویوں کے حقوق حاصل ہوتے اور نہ ہی پہلے خاوندوں سے آزاد ہوتیں کہ کہیں نکاح ثانی کر سکیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس طرح کی قسم اُٹھانے میں مدت کی تحدید فرما دی فرمایا:

لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ [2]

ترجمہ: جو لوگ اپنی عورتوں کے پاس نہ جانے کی قسم کھا لیتے ہیں ان کے لیے چار مہینے کی مہلت ہے اگر وہ رجوع کرلیں تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

(اور اگر طلاق کا عزم کرلیں تو اللہ تعالیٰ سننے اور جاننے والا ہے)

بقول حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اس مدت (چار ماہ) کے تعین میں راز یہ ہے کہ اتنے عرصے میں خواہ مخواہ نفس اپنی صنفی خواہش پورا کرنے پر مائل ہوتا ہے۔ (اس سے زیادہ عرصے تک وہ صبر نہیں کر سکتا) اور اگر وہ اپنی صنفی خواہش کو پورا کرنے سے باز رہے تو اس سے اس کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے [3]

چار ماہ سے کم مدت میں ایلاء نہیں ہوتا [4]

فقہاء کے نزدیک بیوی کے قریب نہ جانے کو اگر ایسی عبادت پر معلق کرے جس میں مشقت اٹھانا پڑتی ہو (مثلاً روزہ، حج، صدقہ وغیرہ) تو یہ بھی ایلاء ہے [5]

---

[1] فتاویٰ عالمگیری: ۱: ۴۷۶

[2] البقرہ: ۲۲۶

[3] حجۃ اللہ البالغہ (مترجم): ۲: ۵۸۰ طبع لاہور

[4] ہدایہ: ۲: ۳۸۹

[5] محمد ابو زہرہ: الاحوال الشخصیہ: ۳۶۵

چار ماہ کے اندر اندر روطی کر لی تو حانث (قسم توڑنے والا ہوگا۔ کفارہ یمین (یعنی قسم کا کفارہ تین روزے یا دس مسکینوں کو کھانا یا کپڑا دینا) اس پر لازم ہوگا اور ایلاء اس طرح ساقط ہو جائے گا[1]

چار ماہ گزرنے کے بعد احناف کے نزدیک خود بخود طلاق بائن واقع ہو جائے گی[2]

مؤلی (ایلاء کرنے والا) رجوع کرنا چاہتا ہو مگر بوجوہ جماع پر قدرت نہ رکھ سکتا ہو (خود یا عورت بیمار ہو، بیوی چھوٹی ہو یا اتنی مسافت پر ہو کہ چار ماہ میں وہاں نہ پہنچ سکتا ہو) تو زبانی رجوع کرلے اور بہتر ہے کہ رجوع پر گواہ بھی بنائے[3]

اور اگر مدت رجوع (چار ماہ) میں جماع پر قدرت رکھ سکے تو ضروری ہے کہ رجوع کے لیے بیوی سے مباشرت کرے[4]

چار ماہ کی مدت میں میاں بیوی کا اختلاف ہو جائے تو میاں کا قول معتبر ہوگا[5]

طلاق بحکم القاضی:

امام ابو حنیفہ کے نزدیک قاضی کو صرف اس وقت طلاق کا حق حاصل ہے جب خاوند میں کوئی ایسا عیب پایا جائے جو تناسل و توالد میں مانع ہو اور پھر عورت طلاق کا مطالبہ بھی کرے۔ اگر عورت خاوند میں اس قسم کا عیب ہونے کے باوجود اس کے ساتھ رہنے پر رضامند ہو تو پھر قاضی کو طلاق کا اختیار حاصل نہیں۔ اگر خاوند قوت مردمی سے محروم ہو (بیماری کی وجہ سے یا طبعی اور خلقی کمزوری کی وجہ سے یا بڑھاپے کی وجہ سے یا صغرسنی کی وجہ سے یا جادو وغیرہ کے اثر سے) اور بیوی کے پاس

---

[1] ہدایہ: ۲: ۳۸۰
[2] ایضاً
[3] ہدایہ: ۲: ۳۸
[4] فتاویٰ عالمگیری: ۱: ۴۸۵
[5] فتاویٰ عالمگیری: ۱: ۴۸۷

جانے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو یا خصی ہو تو قاضی اسے ایک سال کی مہلت دے گا اس دوران وہ علاج معالجہ سے اگر بیوی کے پاس جانے کے قابل ہو گیا تو فبہا ورنہ قاضی ان دونوں کے درمیان تفریق کرا دے گا کیونکہ اس صورت حال میں مقاصد زوجیت ہی فوت ہو جاتے ہیں اور جب مقاصد زوجیت پورے نہ ہو رہے ہوں تو پھر تعلق زوجیت کو قائم رکھنا بے معنی اور معاصی کا باعث ہو سکتا ہے۔ اگر خاوند مقطوع الذکر ( ) ہو تو فی الفور تفریق کرا دی جائے گی۔ امام ابو حنیفہ اور ابو یوسفؒ کے نزدیک مذکورہ تین سبب (نامردی، خصی ہونا، آلہ تناسل کا کٹا ہوا ہونا) ہی سے فرقت کی جا سکتی ہے۔ امام محمد فرماتے ہیں اگر خاوند پاگل ہو یا اسے کوڑھ اور جذام کا مرض ہو تو بھی عورت کو اس بات کا اختیار حاصل ہے کہ وہ بذریعہ قاضی طلاق حاصل کر لے۔

میاں بیوی کا اگر (خاوند کے بیمار ہونے یعنی بیوی کے پاس نہ آ سکنے میں) اختلاف ہو جائے تو دیگر مستورات کے ذریعے عورت کا کنوارپن معلوم کیا جائے گا اور واقعی کنواری ہوئی تو تفریق کر دی جائے گی اور اگر کنواری نہ ہوئی تو پھر قاضی تفریق نہ کرے گا۔[1]

عدّت: عدت کا لفظ عدد سے بنا ہے۔ اور یہ لفظ تعداد کے معنوں میں مصدر خلاف قیاس ہے۔ لغۃً اس کا اطلاق، عورت کے ایام حیض و طہر پر ہوتا ہے۔ حنفی مسلک کے مطابق اس کی اصطلاحی تعریف یوں ہے: عدت وہ مدت مقررہ ہے جو نکاح یا ہمبستری کے آثار ختم ہو جانے کے لیے رکھی گئی ہے۔[2] اس مدت کے دوران شرعاً عورت نکاح ثانی نہیں کر سکتی۔ مرد کے لیے یہ قید نہیں کیونکہ وہ تو پہلی بیوی کی موجودگی میں بھی دوسرا نکاح کر سکتا تھا۔ اب جبکہ اس نے

---

[1] (خلاصہ) ہدایہ: ۲: ۳۹۹ تا ۴۰۱

(ب) محمد ابو زہرہ: الاحوال الشخصیہ: ۳۷۸ تا ۳۸۰

[2] الفقہ علی مذاہب الاربعہ (مترجم): ۴: ۹۰۵ طبع محکمہ اوقاف لاہور

(ب) محمد ابو زہرہ: الاحوال الشخصیۃ: ۳۹۶

پہلی بیوی کو طلاق دے دی ہے تو بدرجہ اولی دوسرا نکاح کر سکتا ہے۔ عدت کی رسم زمانہ جاہلیت میں بھی تھی۔ عرب کے لوگ نسب کے معاملے میں بڑے محتاط تھے۔ عورت (جس کے ساتھ خاوند ہمبستری کر چکا ہے) کو طلاق ملنے یا کسی اور وجہ سے میاں بیوی کے درمیان تفریق ہو جانے یا خاوند کے فوت ہو جانے پر ایک خاص مدت تک عقد ثانی سے رکنا پڑتا تھا تاکہ معلوم ہو جائے کہ زوج اول کا نطفہ رحم میں قرار پا گیا ہے یا نہیں؟ شریعت نے اس چیز کو برقرار رکھا۔ قرآن میں حکم ہوا۔

وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوءٍ [۱]

ترجمہ: مطلقہ عورتیں (جن کو طلاق مل گئی ہے) اپنے آپ کو (عقد ثانی سے) تین قروء (حیض یا طہر) کے لیے روکے رکھیں عدت کا حکم صرف انہی عورتوں کے واسطے ہے جن کے ساتھ خلوت صحیحہ یا ہمبستری ہو چکی ہو۔ جس عورت کے ساتھ ہمبستری کی نوبت نہ آئی ہو اور اسے طلاق ہو جائے تو اس کے لیے کوئی عدت نہیں [۲]

عدت کی تین اقسام ہیں۔

عدت بوضع حمل۔ عدت بالاقراء۔ عدت بالاشہر حاملہ عورت کو اگر طلاق مل جائے یا اس کا خاوند فوت ہو جائے تو اس کی عدت وضع حمل ہے یعنی بچہ جننے تک ہے [۳]

اگر آزاد اور حیض والی عورت کو طلاق ہو جائے تو اس کی عدت امام ابوحنیفہ کے نزدیک تین حیض (ماہواری) ہے [۴]

اور اگر بوجہ بڑھاپا یا صغرسنی یا کسی اور عذر کی وجہ سے ماہواری نہیں آتی تو اس کی عدت تین ماہ ہے [۵]

---

[۱] البقرہ: ۲۲۸
[۲] الاحزاب: ۴۹
[۳] ہدایہ ۲: ۴۰۱
[۴] ایضاً
[۵] ایضاً

خاوند کے فوت ہونے کی صورت میں اگر عورت حاملہ نہ ہو تو اس کی عدت چار ماہ دس دن ہے [1]

مہینوں کا شمار قمری مہینوں کے اعتبار سے ہوگا [2]

طلاق کی صورت میں بعد از طلاق اور وفات کی صورت میں بعد از وفات مدت عدت کا آغاز ہوگا [3]

طلاق بائن کی صورت عدت کے دوران اگر دوبارہ خاوند نکاح کرنا چاہے تو اس پر نئے سرے سے مہر ہوگا [4]

جس عورت کا خاوند فوت ہو جائے اس پر چار ماہ دس دن تک سوگ کرنا ضروری ہے۔ سوگ کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس دوران زیب و زینت نہ کرے۔ خوشبو نہ لگائے، سرمہ نہ استعمال کرے اور نہ ہی بھڑک دار کپڑے پہنے [5]

مطلقہ عورت کے واسطے ضروری ہے کہ وہ عدت وہیں گزارے جہاں وہ قبل از طلاق رہتی تھی [6]

مطلقہ عورت کیلئے یہ بھی جائز نہیں کہ وہ دن میں یا رات میں گھر سے باہر پھرتی پھرے البتہ جس کا خاوند فوت ہو چکا ہے اس کے لیے جائز ہے کہ وہ دن کے وقت اور رات کے کچھ حصہ میں باہر نکل سکتی ہے [7]

---

[1] سورۃ البقرہ: ۲۳۴

[2] الاحوال الشخصیۃ: ۳۰۱

[3] ہدایہ: ۲: ۴۰۴

[4] ہدایہ: ۲: ۴۰۵

[5] ہدایہ: ۲: ۴۰۶

[6] ایضاً

[7] ایضاً

معتدہ (جو عورت عدت گزار رہی ہے) کا نفقہ (طعام، قیام، لباس) مرد کے ذمہ ہے[۱]

البتہ جس کا خاوند فوت ہو گیا اس کا نفقہ خاوند کے ورثاء پر واجب نہیں[۲]

چار قسم کی عورتوں پر عدت نہیں۔

ا۔ جسے دخول (ہمبستری) سے قبل طلاق مل جائے۔

ب۔ جس کا خاوند دار الحرب میں رہ جائے۔

ج۔ دو بہنوں سے نکاح کیا جائے تو فسخ نکاح کے بعد ان پر عدت نہیں

د۔ چار سے زیادہ عورتوں سے نکاح کرنے پر فسخ نکاح کا حکم ہوگا۔ اس صورت میں بھی ان پر عدت نہیں[۳]

اگر عورت کو حالت حیض میں طلاق دی تو عدت میں وہ حیض شمار نہ ہوگا جس میں طلاق دی گئی بلکہ اس کے بعد تین حیض شمار ہوں گے[۴]

مفقود الخبر کی بیوی:

اگر کسی عورت کا خاوند لاپتہ ہو جائے اور کسی طرح یہ معلوم نہ ہو سکے کہ وہ زندہ ہے یا مر گیا ہے یا کس حال میں ہے تو وہ عورت کیا کرے؟ اس سلسلے میں فقہاء کی آراء مختلف ہیں۔ امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب اس طرف گئے ہیں کہ وہ عورت اس وقت تک انتظار کرے جب تک کہ اس کے خاوند کے ہم عمر لوگ زندہ ہوں اور اس کا اندازہ نوے سال، ایک سو بیس سال لگایا گیا ہے۔ مگر حنابلہ اور امام مالک کی یہ رائے ہے کہ چار سال کے بعد اس کے سابق خاوند کو فوت شدہ تصور کر کے اسے عقد

۱۔ الاحوال الشخصیۃ: ۴۰۹

۲۔ ایضاً

۳۔ فتاویٰ عالمگیری: ۱: ۵۲۶

۴۔ فتاویٰ عالمگیری: ۱: ۵۲۷

ثانی کی اجازت دے دی جائے گی۔ امام مالک کا مسلک قرآن و سنت کے زیادہ قریب معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ عورت کو ایک طویل عرصہ تک یوں ہی معلق رکھنا روح شریعت کے خلاف ہے۔ ایک سے زائد بیویوں کے معاملے میں بھی قرآن یہ حکم دیتا ہے کہ کسی کو بالکل نہ چھوڑ دو۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ بعد کے فقہائے حنفیہ نے بھی امام مالک کے مسلک پر فتویٰ دیا ہے۔

ثبوتِ نسب: کم از کم حمل کی مدت باتفاق علماء چھ ماہ ہے۔ زیادہ سے زیادہ میں فقہاء کے اندر اختلاف ہے۔ امام مالک پانچ سال، امام شافعی چار سال اور حنابلہ اور حنفیہ دو سال کے قائل ہیں۔

دوسرے یہ مدت وقت عقد صحیح سے شمار ہوگی[1]

چنانچہ بعد از عقد اگر کوئی عورت چھ ماہ سے کم مدت میں بچہ جنتی ہے تو اس کا نسب ثابت نہ ہوگا یعنی یہ بچہ موجودہ خاوند کا نہ ہوگا[2] اور چھ ماہ سے زائد میں بچہ جنتی ہے تو اس کا نسب ثابت ہوگا[3]

مطلقہ عورت اگر دو سال کے اندر اندر بچہ جنتی ہے تو اس بچے کا نسب طلاق دینے والے ہی کی طرف منسوب ہوگا[4]

اور اگر دو سال پورے ہونے کے بعد بچہ جنا تو اس کا نسب ثابت نہ ہوگا[5] متوفی عنہا زوجہا (جس کا خاوند فوت ہوجائے) کے بچہ کا نسب بھی ثابت ہوگا جب کہ بچے کی ولادت وفات خاوند کے دو سال کے اندر اندر ہو[6] بچہ کی ولادت پر میاں بیوی میں اختلاف ہوجائے۔ میاں کہے کہ ہماری شادی کو چار ماہ ہوئے ہیں اور بیوی کہے چھ ماہ تو بیوی کی بات مانی جائے گی اور بچہ اسی میاں کا ہوگا[7]

وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِالصَّوَاب

---

[1] الاحوال الشخصیۃ: ۴۱۱ - ۴۱۲ [2] فتاویٰ عالمگیری: ۱: ۵۳۶

[3] ایضاً [4] ہدایہ: ۲: ۴۰۹

[5] ایضاً [6] ہدایہ: ۲: ۴۱۰

[7] ہدایہ: ۲: ۴۱۱